PAKSOCIETY
تعلیم و تربیت
دسمبر 2014
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
ایمان، اتحاد، تنظیم
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

دسمبر 2014ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

حکیم لقمان جب اپنے اُستاد سے پڑھ کر فارغ ہو چکے تو اُستاد نے ان سے کہا: ''لقمان! آج ایک بکرا ذبح کرو اور اس میں سے جو چیز تمہیں سب سے اچھی لگے، وہ ہمیں پکا کر کھلاؤ۔'' لقمان نے اُستاد کا حکم بجا لاتے ہوئے بکرا ذبح کیا اور بکرے کے دل اور زبان کو خوب اچھی طرح مسالوں سے بھون کر اُستاد کی خدمت میں پیش کیا۔ اُستاد نے کھانا کھایا تو کھانے کی تعریف کر کے کہا: ''لقمان! آج تم آدھے پاس ہو گئے۔''

دوسرے دن اُستاد نے پھر حکم دیا کہ آج پھر بکرا ذبح کرو اور اس میں جو بُری چیز پاؤ، وہ پکا کر ہماری خدمت میں پیش کرو۔ حکیم لقمان نے بکرا ذبح کر کے پہلے کی طرح دل اور زبان کا انتخاب کیا لیکن اس ترکیب سے پکایا کہ زبان میٹھی اور دل کڑوا پکایا۔ پھر دونوں چیزیں ملا کر اُستاد کو کھانے کے لیے پیش کر دیں۔ اُستاد نے جب کھانے کا ذائقہ چکھا تو بدمزہ پا کر لقمان سے پوچھا: ''لقمان! آج کیا پکا کر لائے ہو؟'' حکیم لقمان نے کہا: ''حضور! وہی دل اور زبان جو آپس میں موافق نہیں۔'' اُستاد نے حکیم لقمان سے کہا: ''جاؤ! آج تم بالکل پاس ہو گئے۔''

حکیم لقمان نے ایک عمدہ مثال قائم کرنے کے لیے دل اور زبان ہی کو چن لیا۔ یہ درست ہے کہ ایک جیسے دل اور زبان سے بڑھ کر کوئی نرم ولطیف اور لذیذ نہیں اور ایک دوسرے سے مخالف دل اور زبان سے زیادہ کوئی چیز بُری اور بدمزہ نہیں۔ جس انسان کا دل اور زبان ایک ہوگا، دُنیا اس کی عزت کرے گی اور خدا بھی خوش ہوگا اور جس کا دل زبان سے موافق نہ ہو، دُنیا بھی اسے اچھا نہیں سمجھتی اور خدا بھی ناخوش ہو جاتا ہے۔

آج سے دو ہزار سال سے زائد عرصہ پہلے اللہ تعالیٰ کے پیارے رسول اور عیسائی مذہب کے بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس دُنیا میں تشریف لائے۔ عیسائی برادری اس تاریخ کو بڑی دھوم دھام سے کرسمس کا تہوار مناتے ہیں۔ تعلیم و تربیت کی جانب سے عیسائی ساتھیوں کو یہ خوشیوں بھرا تہوار مبارک ہو۔

25 دسمبر کو برصغیر کے مسلمانوں کے سب سے بڑے سیاسی لیڈر قائداعظم محمد علی جناح پیدا ہوئے جنہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے اکٹھا کیا اور اپنی ان تھک محنت اور دلی لگن سے ایک آزاد اور خودمختار ملک حاصل کیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے قائد کی خواہش کے مطابق پاکستان کو عالمی برادری میں ایک عظیم ملک بنائیں۔

آپ کے لیے الف لیلیٰ کی کہانیوں کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ الف عربی زبان میں ہزار کو کہتے ہیں اور لیلہ رات کو۔ الف لیلہ عربی ادب کی وہ مشہور کہانیاں ہیں جو ایک ملکہ نے ایک ہزار راتوں تک اپنے بادشاہ کو سنائیں۔ بادشاہ ملکہ سے نفرت کرتا تھا اور اسے قتل کروانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن یہ دل چسپ کہانیاں سننے کے بعد وہ اپنے ارادے سے باز آ گیا اور ملکہ سے محبت کرنے لگا۔ ان کہانیوں کا دُنیا کی بہت سی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے اور ان پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ یہ کہانیاں آپ کو کیسی لگیں اس بارے میں اپنی رائے ضرور دیجیے گا۔

اپنا بہت سا خیال رکھیے گا۔ خوش رہیں، شاد رہیں اور آباد رہیں۔

فی امان اللہ! (ایڈیٹر)

ایڈیٹر، پبلشر: ظہیر سلام
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عابدہ اصغر
سرکولیشن اسسٹنٹ: محمد بشیر راہی

اس شمارے میں

اور بہت سے دل چسپ تراشے اور سلسلے

سرورق: یومِ پیدائش قائداعظمؒ

سالانہ خریدار بننے کے لیے سال بھر کے شماروں کی قیمت پیشگی بنک ڈرافٹ یا منی آرڈر کی صورت میں سرکولیشن منیجر: ماہنامہ "تعلیم و تربیت" 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور کے پتے پر ارسال فرمائیں۔
فون: 36361309-36361310 فیکس: 36278816

پرنٹر: ظہیر سلام
مطبوعہ: فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، لاہور۔
سرکولیشن اور اکاؤنٹس: 60 شاہراہ قائداعظم، لاہور۔

خط و کتابت کا پتا
ماہنامہ تعلیم و تربیت 32۔ ایمپریس روڈ، لاہور۔
UAN: 042-111 62 62 62 Fax: 042-36278816
E-mail:tot.tarbiatfs@gmail.com
tot tarbiatfs@live com

پاکستان میں (بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک) = 850 روپے۔
مشرق وسطیٰ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
ایشیا، افریقا، یورپ (ہوائی ڈاک سے) = 2400 روپے۔
امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا، مشرق بعید (ہوائی ڈاک سے) = 2800 روپے۔

قیمت فی پرچہ: 30 روپے

حمد باری تعالیٰ

رحمتیں ہیں چار سو کتنا ہے تو مہرباں
کرم تیرے کے طفیل ہے آباد یہ جہاں
تو ہی غم جانے سبھی کا تو ہی سب کا غم گسار
تو نہ غم خواری کرے تو پھر کہاں پائیں اماں
ہم خطا کاروں گناہ گاروں پہ تیرا ہے کرم
جن کے ہم قابل نہ تھے وہ کر دیے تو نے احساں
عاجزوں کی گریہ زاری کون دیکھے بن تیرے
سب کو دیکھا سب کو بھالا تجھ سے ہی پائی اماں
اپنی نظروں سے نہ مجھ کو دور کرنا یا شاہا
یاد میں تیری رہیں ہم اے شہنشاہ شاہاں
تو نے پکڑا میرا دامن جب کہ میں برباد تھی
ہے عنایت یہ تیری ہم نہ رہیں بے خانماں
ہر دل بیمار کو تو ہی تو دیتا ہے شفا
مرض مرے دور کر اے شافی اندوہ جاں
میں نسیمؔ ہر گھڑی تیری رہوں شکر گزار
تو ہی دانا تو توانا ہم سبھی ہیں ناتواں

نعت رسول مقبولؐ

بلا لو ہمیں در پہ روضے کے والی
یہی آرزو کر رہے ہیں سوالی
نہیں چین اس دل کو ملتا یہاں پر
لگاؤں میں آنکھوں کو روضے کی جالی
تو ہی پیرِ کامل ہے نوع بشر کا
تیرا آسرا ہو اے امت کے والی
تیرے دین کو جو مٹانے پہ آئے
اسے ہو ہدایت اے صاحب عالی
رکھو لاج امت کی شاہ مدینہ
ہمیں اوڑھنی دے تیری کملی کالی
تیرے در پہ لاؤں میں اشکوں کی مالا
کہ دامن تو دنیا میں کر بیٹھی خالی
بھلا اور تجھے کیوں ملے گا ٹھکانہ
ہیں سب عاصیوں کے مدینے کے والی
نسیمؔ اب اسی در پہ جانا ہے تجھ کو
اسی شاہ کی لونڈی ہی ہے عزت والی

نسیم اختر نسیم

پیارے بچو! ایک انسان کو زندہ رہنے کے لیے جس طرح غذا، پانی اور ہوا کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح انسانی روح کو ''ایمان'' کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی روح ایمان ہی کی بدولت صحت اور قوت پاتی ہے۔ ایمان دُنیا کی تمام دولتوں میں سے عظیم ترین دولت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں ایک مسلم گھرانے میں پیدا فرمایا اور ایمان کی دولت سے مالامال فرمایا۔ ہمیں اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہیے اور اس کی حفاظت کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے اور اپنے ایمان کو تازہ کرتے رہنا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ارشاد فرمایا کہ ''اپنا ایمان تازہ کیا کرو۔'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ ''ہم اپنا ایمان کیسے تازہ کریں؟'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کثرت سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ پڑھا کرو۔ (مسند احمد، مسند ابی ہریرۃ:8710)

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی کثرت و تکرار سے ایمان تازہ ہوتا ہے، دل نور اور یقین سے بھر جاتا ہے۔ پھر جب دل منور ہو جائے اور یقین کامل ہو جائے تو نیک اعمال کی توفیق ملنے لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں ایمان اور نیک اعمال پر ہی جنت ملنے کی خوش خبری سنائی ہے۔ قرآن پاک اور روایاتِ حدیث سے اس کلمہ کے بے شمار فوائد معلوم ہوتے ہیں جن میں سے چند فوائد ذکر کیے جاتے ہیں:

1۔ افضل ذکر: حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''سب سے افضل ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔'' (ابن ماجہ، کتاب الادب:3800)

احادیث مبارکہ میں بہت سے اذکار مذکور ہیں مگر ان سب میں سے افضل ذکر لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔

2۔ جنت کی چابی: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''جنت کی چابیاں لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی گواہی دینا ہے۔'' (مسند احمد، تتمہ مسند الانصار:22102)

3۔ آسمان کے دروازوں کا کھل جانا: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ''جب کوئی مسلمان خلوصِ دل کے ساتھ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتا ہے تو آسمان کے سب دروازے کھل جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا یہ ذکر عرش تک جا پہنچتا ہے۔ یہ فضیلت اس بندے کو اس وقت تک حاصل رہتی ہے جب تک وہ بڑے گناہوں سے بچتا رہتا ہے۔'' (ترمذی، ابواب الدعوات:3590)

پیارے بچو! لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ایسا کلمہ ہے جس کی تمام انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی اُمتوں کو دعوت دی۔ یہ جنت کے خزانوں میں سے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین کلمہ ہے۔ اس کا ثواب جھٹ پٹ عرش تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کا ثواب اُحد پہاڑ کے برابر ہے۔ اس کے پڑھنے والے کے لیے جنت میں ایک درخت لگ جاتا ہے۔ جو اس کا ورد کرتا ہے اس کے گناہ ایسے گرتے ہیں جیسے درخت سے پتے گرتے ہیں۔

یہ سب فوائد احادیث طیبہ سے ثابت ہیں لیکن یہ بے شمار فائدے اور ایمان کی تازگی تبھی حاصل ہو گی جب ہم اس کو بار بار پڑھیں گے اور اچھے اچھے کام کریں گے۔

☆☆☆

"یہ بچہ ایک دن بادشاہ بنے گا۔" یہ پیش گوئیاں اس بچے کے بارے میں اس کے خاندان کے لوگ کر رہے تھے، جس نے کراچی کے ایک تاجر جناح پونجاہ کے گھر 25 دسمبر 1876ء کو جنم لیا۔ یہ کراچی کا علاقہ کھارادر تھا اور وہاں ایک عمارت وزیر مینشن آج بھی موجود ہے۔ وہیں بچے کے ماموں قاسم موسیٰ، مبارک بادیوں اور دُعاؤں کے ہمراہ بہن کے گھر آئے اور اپنے بھانجے کا نام محمد علی رکھا۔ بہن مٹھی بائی بھی اپنے پہلے بچے کی پیدائش پر خوشیوں سے نہال تھی۔ بچے کا نام محمد علی سب نے ہی پسند کیا، کیوں کہ یہ خالصتاً اسلامی نام تھا، ورنہ اس سے قبل سابق ہندو گھرانوں کی نسبت سے نام رکھنے کا رواج تھا۔

جب ننھا محمد علی سات سال کا ہوا تو اسے 1883ء میں ابتدائی تعلیم کے لیے بولٹن مارکیٹ میں قائم ایک دیسی زبانوں کے اسکول میں داخل کرایا گیا۔ وہاں سے اس نے چوتھی جماعت گجراتی میں مکمل کی۔ محمد علی کے والد خود بھی صاحبِ علم تھے اور کچھ عرصے درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے تھے۔ انہوں نے انگریزی زبان کے چرچ مشن اسکول کی بجائے اپنے بیٹے کو سندھ مدرستہ الاسلام کراچی میں داخل کرایا۔ یہ تعلیمی ادارہ سرسید احمد خان کے علی گڑھ میں قائم مدرستہ العلوم سے متاثر ہو کر کراچی کے مشہور وکیل حسن علی آفندی نے قائم کیا تھا۔ بعد میں علی گڑھ میں قائم مدرستہ العلوم پہلے کالج اور پھر علی گڑھ یونی ورسٹی بنا۔

4 جولائی 1887ء کو محمد علی کو انگریزی کی پہلی جماعت میں داخل کیا گیا۔ چند ماہ بعد وہ یہ تعلیمی ادارہ چھوڑ کر بمبئی چلا گیا، جہاں اس کے ماموں قاسم موسیٰ رہتے تھے اور پھر والد جناح پونجاہ نے بھی تو اپنا کاروبار وہاں جما لیا تھا۔ محمد علی بمبئی کے انجمن الاسلام ہائی اسکول کی پہلی جماعت میں داخل ہوا۔ بمبئی میں محمد علی کا دل نہیں لگا، کیوں کہ وہ اپنی ماں سے زیادہ عرصے دُور رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بار پھر سمندر کے طویل سفر کے بعد محمد علی کراچی پہنچا اور سندھ مدرستہ الاسلام کا طالب علم بنا۔ یہاں وہ چوتھی جماعت تک پڑھتا رہا مگر پھر ایک دن طویل غیر حاضری کے باعث اس کا داخلہ منسوخ کر دیا گیا۔ یہ 1890ء کا سال تھا۔ بعد میں تیسری بار اس نے سندھ مدرستہ الاسلام میں داخلہ لیا اور امتحان میں نمایاں کام یابی حاصل کی۔ وہ پانچویں درجے میں تھا جب اس کے والد نے اسے انگلستان بھیجنے کا ارادہ کیا۔ اس موقع پر اس کی والدہ کا خیال تھا کہ انگلستان بھیجنے سے پہلے محمد علی کی شادی کر دی جائے۔

یہ محمد علی بعد میں محمد علی جناح کے نام سے متحدہ ہندوستان کی سیاست کے بے تاج بادشاہ کہلائے اور کانگریس و مسلم لیگ میں

شامل ہوئے۔ بعد میں مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کے لیے ان کی انتھک کوششوں کی بناء پر انہیں ''قائداعظم'' کا خطاب دیا گیا جس کے بلا شبہ وہ حق دار تھے۔ قائداعظم کی قیادت میں مسلمانوں نے پاکستان حاصل کیا۔

سرکاری سطح پر قائداعظم محمد علی جناح کی پہلی سوانح عمری انگریزی مؤرخ ہیکٹر بولائتھو نے "Jinnah Creator of Pakistan" کے نام سے لکھی۔ اس میں انہوں نے قائداعظم کے بچپن کے حالات ان کے دوستوں اور بزرگوں کی مدد سے تحریر کیے ہیں۔ ان کی بزرگ خاتون فاطمہ بائی نے ان کے بچپن کا واقعہ بیان کیا۔ رات کو جب بچے سو جاتے تو محمد علی جناح ایک چھوٹا تختہ لیمپ کے سامنے کھڑا کر دیتے تاکہ روشنی سوئے ہوئے بچوں کے چہرے پر نہ پڑے، اور پھر وہ رات گئے تک پڑھتے رہتے۔ ایک رات میں ان کے پاس گئی اور کہا: ''بچے اتنا نہ پڑھا کر، بیمار ہو جائے گا۔'' جناح نے جواب دیا: ''اگر میں محنت نہیں کروں گا تو زندگی میں کوئی بڑا کام نہ کرسکوں گا۔''

ان کے بچپن کے دوست نانجی جعفر بیان کرتے ہیں۔ ''بچپن میں مَیں جناح کے ساتھ اسکول میں پڑھا کرتا تھا اور اس کے ساتھ گلی میں گولیاں کھیلتا تھا، لیکن جب جناح 14 برس کا ہوا تو ایک صبح اس نے مجھ سے کہا: ''مٹی میں گولیاں نہ کھیلو، اس سے ہاتھ اور کپڑے دونوں گندے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں کھڑے ہو کر کرکٹ کھیلنی چاہیے۔ پھر دوسرے لڑکوں کے ساتھ میں نے بھی گولیاں کھیلنا چھوڑ دیا اور ہم گندی گلی سے نکل کر کھلے میدان میں پہنچ گئے جہاں جناح کرکٹ کا بلا اور وکٹ لے آیا۔ دو سال بعد جب وہ انگلستان جانے لگا تو مجھے کہا کہ میں تو جا رہا ہوں، میری غیر موجودگی میں تم لڑکوں کو کرکٹ کھیلنا سکھاتے رہنا۔''

ہیکٹر بولائتھو نے ان کے لندن روانگی کا سبب بتاتے ہوئے لکھا ہے: ''جس زمانے میں محمد علی جناح نے اسکول کی تعلیم ختم کی، ان دنوں فریڈرک لے کروٹ (Frederick Leigh Croft) نامی ایک شخص بمبئی اور کراچی میں صرافے کا کام کرتا تھا۔ وہ بتیس برس کا ایک غیر شادی شدہ، خوش پوش اور ہنس مکھ آدمی تھا۔ انگلستان کے لارڈ کے خطاب اور جائیداد کا وارث تھا، مگر لوگوں سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ وہ بچوں سے بھی گھبراتا تھا، لیکن محمد علی جناح کی قابلیت سے خاصا متاثر تھا۔ اس نے ان کے والد جناح پونجا کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قانون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے انگلستان بھیجیں۔ محمد علی جناح ابھی پورے سولہ برس کے بھی نہ ہوئے تھے کہ انہوں نے وطن سے روانہ ہو کر چند ہفتوں کا بحری سفر طے کیا اور لندن پہنچ گئے۔ یہی وہ دُنیا تھی جہاں ان کی ذہنی نشوونما ہوئی اور جس کی زندگی نے ان کے دماغ، امنگوں اور مزاج پر وہ اثر قائم کیا جو ان پر ساری زندگی قائم رہا۔''

لندن میں قیام اور کسی اچھے تعلیمی ادارے میں داخلہ یقیناً اہم کام تھے جو فوری کرنے تھے۔ جلد ہی انہیں کنگینٹن کے علاقے 35 رسل روڈ پر ایک اچھی رہائش مل گئی اور کچھ عرصے بعد قانون کی تعلیم کے لیے لنکن اِن میں داخلہ بھی لے لیا۔ انہوں نے لنکن اِن میں داخلہ کیوں لیا، جب کہ دوسرے قانونی تعلیمی ادارے بھی موجود تھے۔ اس کا جواب قائداعظم نے پاکستان کے نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے کراچی بار ایسوی ایشن کی جانب سے 1947ء میں دیے گئے استقبالیے میں بیان فرمایا:

''جب میں انگلستان میں قانون کی تعلیم کے لیے داخلہ لینے کے لیے مختلف اداروں میں جا رہا تھا تو مجھے لنکن اِن کے داخلی دروازے پر موجود ایک بورڈ پر ان عظیم ہستیوں کے نام لکھے نظر آئے جنہوں نے انسانوں کو مختلف قانون عطا کیے۔ ان میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی سب سے اوپر نمایاں تھا۔ میں نے یہ دیکھ کر فیصلہ کیا کہ میں اس تعلیمی ادارے میں پڑھوں گا۔''

انہوں نے لندن کے اس تعلیمی ادارے سے بار ایٹ لاء کا کورس دو سال میں ختم کرلیا، لیکن لنکن اِن کی رسمی تقریبات کے لیے انہیں ایک سال کے لیے مزید انگلستان رُکنا پڑا۔ یہ عرصہ انہوں نے برٹش میوزیم لائبریری میں مطالعہ کر کے گزارا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لنکن اِن سے بار ایٹ لاء کرنے والے سب سے کم عمر طالب علم تھے۔ انہوں نے جب یہ امتحان پاس کیا تو ان کی عمر فقط 19 سال تھی۔

قائداعظم وکیل بن کر متحدہ ہندوستان آئے اور وکالت کے ساتھ مسلمانوں کے مطالبات کے لیے جدوجہد بھی کرتے رہے۔ بالآخر طویل جدوجہد کے بعد وہ دن آ گیا جب پاکستان دُنیا کے نقشے پر نئے آزاد ملک کی حیثیت سے اُبھرا اور قائداعظم محمد علی جناح اس کے پہلے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

☆☆☆

نورمحل کی کہانی

جدون ادیب

میرا نام نورمحل ہے، میں ایک عام سی لڑکی ہوں جو چوتھی جماعت میں پڑھتی ہے۔ میرا تعلق غریب گھرانے سے ہے۔ ہمارا خاندان، والدین اور میری ایک بڑی بہن پر مشتمل ہے۔ میرے ابو ایک فیکٹری میں چوکی دار ہیں۔ ہم ماں بہنیں سلائی کڑھائی اور کشیدہ کاری کا کام کرتی ہیں۔ میں چوں کہ چھوٹی ہوں، لہٰذا گھر کی صفائی اور برتن دھونا میرے ذمے ہے۔ ہم اس شہر میں اکیلے رہتے ہیں۔ ہمارے باقی سارے رشتے دار سوات میں ہیں۔ وہاں ہماری کچھ زمین ہے جو گروی پڑی ہے۔ ہم اس زمین کو چھڑوانا چاہتے ہیں۔ اسی لیے ہم سب اس مقصد کے لیے سخت محنت کرتے ہیں، حتیٰ کہ ہمارے ابو فیکٹری میں اوور ٹائم لگاتے ہیں۔ جب گروی کے لیے مطلوبہ رقم جمع ہو جائے گی تو ہم واپس وطن لوٹ جائیں گے۔

اس چھوٹی سی عمر میں میرے نرم و نازک ہاتھ قدرے سخت اور کھردرے ہو چکے ہیں لیکن اسی جدوجہد اور دشوار گزار معمولات نے میری زندگی کی ایک خوب صورت کہانی تشکیل دی ہے۔

اس دن اسکول میں اورنج ڈے تھا۔ لڑکیاں خاص طور پر تیار ہو کر آئی تھیں۔ چوڑیاں پہننے کی اجازت تھی اور یونی فارم کی پابندی بھی نہیں تھی۔ لڑکیوں نے مہندی بھی لگائی ہوئی تھی۔ مس سیما جن کی کوششوں سے اسکول میں ہم نصابی سرگرمیاں ہو رہی تھیں، لڑکیوں کے مہندی کے ڈیزائن دیکھ رہی تھیں۔ میں نے بھی اپنے ہاتھوں پر خوب صورت ڈیزائن بنایا تھا۔ مس سیما نے میرا ہاتھ تھام کر مذاقاً کہا کہ نورمحل، تمہارے ہاتھ کتنے سخت ہیں، کسی کو پڑ گئے تو دن میں تارے نظر آ جائیں گے......

شاید مس سیما کو احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک نامناسب بات کہہ دی ہے، لہٰذا انہوں نے فوراً میرے مہندی کے ڈیزائن اور میرے کپڑوں کی تعریف کی اور میری سہیلیوں سے کہا کہ وہ نورمحل کی طرح اپنے والدین کی مدد کریں۔ نورمحل ایک مثالی لڑکی ہے، وغیرہ وغیرہ۔

مگر سچی بات یہ ہے کہ مجھے بہت دُکھ ہوا تھا۔ بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتیں بڑے دکھوں کا سبب بن جاتی ہیں اور ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔ آج میں سوچتی ہوں کہ مجھے اتنا زیادہ دکھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگر کوئی بات حقیقت ہے تو اسے تسلیم کر لینا چاہیے۔ مجھے فخر ہے کہ میں ایک جفاکش لڑکی ہوں مگر میرا دل آئینے کی طرح ہے جیسا سب کا ہوتا ہے، اسے سخت ٹھیس پہنچی تھی۔

سر سہیل ہمیں اُردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے ایک بار کہا تھا کہ لڑکیوں کو رونے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ انہیں تو رونے کا بہانہ چاہیے بلکہ وہ بلاوجہ بھی روتی ہیں! میرا دل بھی رونے کو چاہ رہا تھا مگر میں سب کے سامنے نہیں رو سکتی تھی۔ بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے رہی۔ رنگین تقریب میرے لیے بے رنگ اور بے مزہ ہو گئی۔ میری سہیلیوں نے میری بدلی ہوئی کیفیت کو محسوس کر لیا۔ انہوں نے بہت پوچھا مگر میں نے سر درد کا بہانہ کر دیا اور کسی کو

اپنے دل کی بات نہیں بتائی۔

پھر میں اکثر اُداس رہنے لگی۔ پڑھائی سے میرا دل اچاٹ ہو گیا۔ گھر کے کاموں میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ سر سہیل کے پڑھانے کا انداز بہت دل کش تھا۔ وہ ہمیں روز نئی نئی باتیں بتاتے۔ ان کی نظر سے ہم نئی دُنیاؤں کو دیکھتے تھے۔ وہ اسکول بھر کے پسندیدہ اُستاد تھے۔ اگر کسی پیریڈ کے بعد وہ دو چار منٹ رُک جاتے تو دوسری جماعت کے بچے انہیں لینے کے لیے پہنچ جاتے۔ انہوں نے میری کیفیت کو محسوس کر لیا۔ وہ میرے جوابات سے مطمئن نہیں ہوئے اور مجھ سے وہ بات اُگلوا کر ہی دم لیا۔

انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور میرے ہاتھ تھام کر بولے: ”ہاں، تمہارے ہاتھ سخت ہیں مگر خوب صورت بھی ہیں۔ اپنے ان سخت ہاتھوں سے جہالت کا گلا دبا دو...... ہماری غربت کا سبب جہالت ہے۔ کچل دو اس کو......“

اس دن میری زندگی ہی بدل گئی۔ میرے اندر ایک نئی توانائی پیدا ہوگئی۔ میں دل و جان سے اپنی تعلیم حاصل کرنے لگی۔ میرا شمار اوسط درجے کی طالبات میں ہوتا تھا مگر جلد میں تمام اساتذہ کی نظر میں آ گئی اور میرا شمار کلاس کی ذہین لڑکیوں میں ہونے لگا۔ سالانہ امتحان ہوئے اور پھر تقریب تقسیم اسناد و انعامات منعقد ہوئی۔

مجھے اپنے رزلٹ کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی۔ مجھے پتا تھا کہ میں اچھے نمبروں سے پاس ہو جاؤں گی مگر جب سر سہیل کو دوسری جماعت کے پوزیشن لینے والے بچوں کو انعام دینے کے لیے اسٹیج پر بلایا گیا تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش میں بھی کوئی پوزیشن لوں اور اپنے پسندیدہ سر سے انعام وصول کروں۔ ایک تصویر ان کے ساتھ بنے جو میرے لیے ایک یادگار کے طور پر محفوظ رہے۔

میں سوچ رہی تھی کہ اگر مجھے پہلے یہ پتا چل جاتا کہ انعام سر سہیل دیں گے تو میں اس سے زیادہ محنت کرتی۔ مجھ پر مایوسی طاری ہوئی تو مجھے خدا شدت سے یاد آیا۔ میں نے اس لمحے دعا کی: ”یااللہ! مجھے کوئی پوزیشن دے دے، چاہے تیسری ہی ہوتا کہ میں سر سہیل سے انعام لے سکوں۔ ان کے ساتھ میری تصویر بنے۔ میں تجھ سے بس یہی چاہتی ہوں اور ہر حال میں چاہتی ہوں!“

میرے ہاتھ دُعا کے لیے اُٹھے اور آنکھوں میں آنسو جمع ہونے لگے۔ بہت روکا مگر کچھ آنسو بہہ ہی نکلے۔ اسٹیج سے تیسری پوزیشن کے لیے کلثوم کا نام پکارا گیا۔ سب اس کے لیے تالیاں بجا رہے تھے مگر میں لاتعلق اور گم صم بیٹھی رہی۔ پھر زینب کا نام پکارا گیا۔ میری کیفیت بہت عجیب ہو رہی تھی۔ میرا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اردگرد کی آوازیں گڈمڈ ہو کر ذہن میں گونج رہی تھیں اور میری آنکھیں بند تھیں۔ اسی کیفیت میں میرا بازو کسی نے زور سے ہلایا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ اسٹیج سے پہلی پوزیشن کے لیے میرا نام دوسری بار لیا جا رہا تھا۔ میں نے بے یقینی سے اسٹیج کی طرف دیکھا، پھر اپنی شور مچاتی کلاس فیلوز پر نظر دوڑائی اور سحر زدہ کیفیت میں اسٹیج کی طرف بڑھی۔ جب میں نے سر سہیل سے ایوارڈ لیا تو ان کی طرف دیکھا۔ آنکھوں میں موجود آنسوؤں کی وجہ سے انہیں ٹھیک سے دیکھ بھی نہیں پائی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا: ”اُدھر دیکھو کیمرے کی طرف اور تھوڑا سا مسکراؤ......“

کیمرے کے فلیش کئی بار چمکے۔ چوں کہ میری کامیابی غیر متوقع تھی، اس لیے میری سہیلیاں نور محل زندہ باد کے نعرے لگا رہی تھیں اور نسبتاً زیادہ شور شرابہ اور ہنگامہ برپا تھا۔ میں نے اپنی دعا کی قبولیت پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔ میں بہت خوش تھی، میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میری امی اور بڑی بہن بھی مہمانوں کی نشست گاہ میں موجود تھیں، وہ بھی بہت خوش تھیں۔ ہر طرف خوشیاں رقص کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔ خوشی ہو یا دکھ، وقت آخر گزر جاتا ہے، میری زندگی کے یہ یادگار لمحات بھی گزر گئے اور ایک حسین یاد بن گئے۔

کچھ دن گزرے میں تیسری جماعت میں بیٹھی تھی کہ ہمارے انچارج سر سجاد جماعت میں آئے۔ انہوں نے مجھے شاندار کامیابی پر مبارک باد دی اور کہا: ”آپ اپنے اساتذہ کے اعتماد پر پوری اُتری ہیں۔ علم کا جنون کوئی آپ سے سیکھے۔ تمام اساتذہ آپ سے خوش اور مطمئن ہیں۔ سر سہیل کی رائے ہے کہ آپ کو پروموشن دی جائے۔ وہ پُرامید ہیں کہ آپ چوتھی کلاس کی پڑھائی بھی کور کر لیں گی!“

”ان شاء اللہ سر!“ میں نے پورے اعتماد سے کہا۔

”او کے، کل سے آپ چوتھی کلاس جوائن کریں گی۔ یہ رہا پروموشن لیٹر!“ پوری کلاس نے میرے لیے زوردار تالیاں بجائیں۔ خوشی ہو یا غم، رونا تو آ ہی جاتا ہے۔ خوشی ایک کلاس آگے جانے کی اور غم سہیلیوں سے بچھڑنے کا۔ آخر یہ وقت بھی گزر گیا اور اب تو میں سالانہ امتحان کی تیاری کر رہی ہوں، اوّل پوزیشن میرا ہدف ہے۔ جہالت کے خلاف میری سخت محنت جاری ہے۔ میں اپنے اساتذہ پر فخر کرتی ہوں۔ خاص طور پر سر سہیل پر۔ میری خواہش ہے کہ تمام اُستاد میرے سر سہیل جیسے ہو جائیں۔ میں یہ کہانی اپنے اُستاد کے لیے لکھ رہی ہوں اور اُمید ہے کہ یہ کہانی اُستاد اور شاگرد کے تعلق کو مضبوط بنانے اور اُستاد کے مرتبے کو بلند کرنے کا سبب بنے گی۔ ☆☆☆

یہ موسم سرما کی ایک تاریک رات تھی۔ دھند کی سفید چادر چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ رحیم داد اپنی بیوی بچوں کے ساتھ کمرے میں سو رہا تھا۔ دروازے کی کنڈی اس نے اندر سے لگا رکھی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ باہر ڈبو موجود ہے۔ ڈبو اس کے پالتو کتے کا نام تھا۔ یہ ڈبو کی ذمہ داری تھی کہ رات میں وہ گھر کی حفاظت کرے۔ ویسے تو رحیم داد کے گھر میں کوئی قیمتی چیز موجود نہیں تھی لیکن ایک چیز ایسی ضرور موجود تھی کہ جسے قیمتی کہا جا سکتا تھا۔ اس کے وسیلے سے رحیم داد کے گھر کا خرچ چل رہا تھا۔ کالی رحیم داد کی بھینس کا نام تھا۔ وہ صبح اور شام کے اوقات میں کل دس کلو دودھ دیتی تھی۔ رحیم داد دن کا زیادہ وقت کالی کی خدمت میں گزارتا تھا۔ اس کام میں اس کی مدد بدھو کرتا تھا۔ بدھو رحیم داد کے گدھے کا نام تھا کیوں کہ وہ گدھا تھا۔ اس لیے رحیم داد ہمیشہ اسے بدھو کہہ کر ہی پکارتا تھا۔ بدھو چارہ لانے کے علاوہ ایک کام اور بھی کرتا تھا۔ رحیم داد کے پاس دن میں چار، پانچ گھنٹے فرصت کے ہوتے تھے۔ اس وقت میں رحیم داد اپنی گدھا گاڑی کے ہمراہ شہر چلا جاتا تھا اور لوگوں کا ساز و سامان وغیرہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتا تھا۔ اس کام میں بھی تھوڑی بہت رقم ہاتھ لگ جاتی تھی۔ یوں رحیم داد کی زندگی کی گاڑی بھی چل رہی تھی۔

رات بھر جاگنا ڈبو کی فطرت میں شامل تھا۔ اس لیے اُسے کوئی مشکل نہیں تھی اور کالی کے بھی مزے تھے۔ سارا دن کُھرلی میں چرنا اور دن میں کھیتوں کی سیر کرنا۔ مصیبت میں تو بدھو مبتلا تھا۔ اسے سارا دن کام کرنا پڑتا تھا۔ غربت اور محرومیوں نے رحیم داد کو غصیلا اور چڑچڑا بنا دیا تھا۔ وہ اپنا سارا غصہ بے چارے بدھو پر نکالتا تھا۔ گدھوں کی طرح پٹائی کرنا...... یہ محاورہ بدھو پر صادق آتا تھا۔

بدھو اس وقت اپنے کھونٹے سے بندھا ہوا تھا۔ دوپہر میں سامان ڈھوتے ہوئے رحیم داد نے جو اس کی پیٹھ پر ڈنڈے مارے تھے، اسے وہاں درد ہو رہا تھا۔ وہ کھڑا کھڑا اونگھ رہا تھا۔ کالی کو سردی کی شدت سے بچانے کے لیے رحیم داد نے اس کی کُھرلی پر بانسوں کی مدد سے مصنوعی چھت بنا دی تھی جب کہ بدھو بے یار و مددگار تھا۔ اسے سردی بھی لگ رہی تھی لیکن اس نے اپنے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔

ڈبو صحن میں ایک بوسیدہ سی ہڈی کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اچانک وہ چونک پڑا۔ اس نے ہوا میں خطرے کی بو سونگھ لی تھی۔ دو اجنبی رحیم داد کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ اپنا کھیل چھوڑ کر بدھو کے پاس چلا آیا۔ بدھو نے نقاہت سے ڈبو کی طرف دیکھا۔ ڈبو کی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔

’’کیا ہوا......؟‘‘ بدھو نے پوچھا۔
’’میں آج رات بھی وہی بو سونگھ رہا ہوں جو میں نے کل رات سونگھی تھی۔‘‘ ڈبو بہت سہا ہوا تھا۔
’’تو پھر مالک کو ہوشیار کرو......‘‘ بدھو نے مشورہ دیا۔
’’کل رات بھی تو ہوشیار کیا تھا۔ پھر تم نے انجام نہیں دیکھا۔ کتنی سنگ دلی سے مالک نے مجھے پیٹا تھا......‘‘ ڈبو درست کہہ رہا تھا۔ کل رات ڈبو نے خطرے کی بو سونگھ کر بھونک بھونک کر رحیم داد کو نیند سے جگا دیا تھا۔ جب رحیم داد کو کوئی خطرہ نظر نہ آیا تو اس نے اسی ڈنڈے سے ڈبو کی پٹائی کر دی تھی جس ڈنڈے کا شکار اکثر بدھو ہوتا رہتا تھا۔ کل رات گاؤں کے دو چور رحیم داد کی بھینس کھولنے کے لیے آئے تھے لیکن کتے کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ واپس لوٹ گئے تھے۔ آج وہ ایک کوشش اور کرنا چاہتے تھے۔ رحیم داد کے صحن کی دیوار تقریباً چھ فٹ اونچی تھی۔ یہ اینٹوں اور گارے کی مدد سے بنائی گئی تھی۔ وہ دونوں چور دیوار کی دوسری طرف موجود تھے لیکن آج کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں آئی تھی۔ آج چوری کے لیے ماحول سازگار تھا۔ انہوں نے دیوار میں نقب لگانا شروع کیا۔ وہ ایک ایک کر کے اینٹیں ہٹا رہے تھے اور دیوار میں خلا بنتا جا رہا تھا۔ یہ منظر ڈبو اور بدھو دیکھ رہے تھے۔’’ڈبو! مالک کو خطرے سے آگاہ کرنا تمہاری ذمہ داری ہے۔ بھونکو اور مالک کو نیند سے جگاؤ تاکہ وہ کالی کی حفاظت کر سکے......‘‘ بدھو ڈبو کو سمجھا رہا تھا۔
نا بابا نا...... مالک کون سا ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے۔ اس کی جتنی بھی خدمت کر لو وہ ہمارا خیال نہیں رکھتا۔ پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں دیتا، اوپر سے مار پیٹ بھی کرتا ہے۔ کتنی ہی بار اس نے مجھے اپنی لات سے ٹھوکر ماری ہے۔ وہ تو میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں جو ہمیں ایک نوالہ کھلا دے ہم اس کے وفادار بن جاتے ہیں۔ ورنہ تو میں کب کا گھر چھوڑ کر بھاگ جاتا......‘‘ ڈبو شکوے کر رہا تھا۔’’تو پھر اپنی فطرت سے کیوں بھاگ رہے ہو۔ مالک کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کرو......‘‘
’’مجھے کل والی پٹائی یاد ہے۔ میں تو آج رات چپ ہی رہوں گا۔ میرا کیا نقصان...... نقصان تو مالک کا ہی ہو گا نا...... اور ویسے بھی ایسے ظالم مالک کو سزا ملنی ہی چاہیے۔‘‘ ڈبو نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ چوروں نے دیوار میں چار فٹ چوڑا سوراخ بنا لیا تھا اور تھوڑی دیر کی بات تھی۔ پھر چور اس قابل ہو جاتے کہ اس خلا میں سے وہ رحیم داد کی بھینس کو نکال کر لے جاتے۔ یہ اپنی اپنی فطرت کی بات تھی۔ کالی کو کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ مالک کے گھر ہو یا چور کے گھر اسے تو بس چارے سے مطلب تھا اور بدھو کی فطرت میں بوجھ اُٹھانا لکھا تھا۔ اس کی کوئی ذمہ داری نہیں تھی اور جس کی ذمہ داری تھی وہ اپنی فطرت سے بھاگ رہا تھا۔ ایسے میں بدھو نے ایک فیصلہ کیا۔ کبھی کبھی فطرت کے خلاف چلنا کامیابی کے دروازے کھول دیتا ہے۔ چور دیوار میں نقب لگانے کے حوالے سے اپنا کام کامیابی سے سرانجام دے چکے تھے۔ اب انہیں رحیم داد کے گھر

میں داخل ہونا تھا۔ ایسے میں ایک بہت تیز آواز فضا میں گونجی۔

''ڈھینچوں...... ڈھینچوں...... ڈھینچوں......'' یہ بدھو تھا۔ وہ پورا زور لگا کر چیخ رہا تھا۔ فوراً ہی رحیم داد کے بند کمرے کی بجلی جل اُٹھی۔ چور گھبرا کر بھاگ نکلے۔ ان کی محنت بے کار گئی تھی۔ ایک گدھے نے سارا کام بگاڑ دیا تھا۔ رحیم داد آنکھیں ملتا کمرے میں سے باہر نکلا۔ وہ بہت غصے میں نظر آ رہا تھا۔

''احمق گدھے...... تجھے رات میں بھی سکون نہیں ہے......'' وہ چیخ کر بولا۔ چوروں کو بھاگتے دیکھ کر بدھو کو اور زیادہ جوش آ گیا تھا۔

''ڈھینچوں...... ڈھینچوں...... ڈھینچوں......'' وہ اور زیادہ تیز آواز میں رینکنے لگا جیسے رحیم داد سے کہہ رہا ہو ...... مالک...... مالک...... میں نے وفاداری کا حق ادا کر دیا ہے۔ رحیم داد کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ میری ڈانٹ سن کر بھی یہ گدھا خاموش نہیں ہوا۔ دروازے کے پاس ہی ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ رحیم داد نے ڈنڈا پکڑ لیا۔ ڈنڈے پر اس کی گرفت بہت مضبوط تھی۔ پھر وہ لپک کر بدھو کے پاس پہنچا۔ اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور پھر ایک زور دار ضرب بدھو کی پیٹھ پر لگی۔ بدھو کی آواز گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔

ایک...... دو...... تین...... چار...... رحیم داد جیسے پاگل ہو چکا تھا۔ بدھو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ پہلے وہ پٹنے پر مزاحمت کرتا تھا لیکن آج تو وہ اپنی جگہ پر ساکت کھڑا تھا۔ آج رحیم داد کے ظلم اور بدھو کے صبر کا امتحان تھا۔ ڈبو خاموشی سے ایک کونے میں دبکا ہوا تھا۔ وہ بدھو کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے سوال پوچھ رہا ہو۔

''کیوں میں نا کہتا تھا یہاں وفا کا کوئی صلہ نہیں ملتا......؟''

بدھو کے پاس اُس کے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ پھر رحیم داد کا ہاتھ اُٹھے کا اُٹھا ہی رہ گیا۔ بدھو کو پیٹتے ہوئے اچانک ہی اس کی نظر دیوار کی طرف جا ٹکرائی تھی۔ ایک بڑا سا خلا دیوار میں موجود تھا۔ سامنے کالی کھڑی تھی۔ ایک لمحے میں رحیم داد ساری داستان سمجھ گیا۔ وہ انجانے میں اپنے محسن پر ڈنڈے برسا رہا تھا۔ چھن سے کوئی چیز اس کے سینے میں ٹوٹ کر رہ گئی۔ یہ اس کے دل کی سختی تھی۔ ڈنڈا اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر جا گرا۔ پھر نا جانے کیا ہوا، آنسوؤں کا ایک طوفان رحیم داد کی آنکھوں میں اُمڈ آیا۔ وہ گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گیا اور اپنی بانہوں کا ہار بدھو کے گلے میں پہنا دیا۔

''تو بے زبان ہے۔ میں تم سے معافی مانگوں تو کیسے مانگوں......'' رحیم داد سسک پڑا۔ پھر اس نے اپنے سوال کا جواب خود ہی دیا۔ ''میری تلافی ایک ہی طریقے سے ہو سکتی ہے۔ اب میں تم سے اچھا سلوک کروں گا......'' پھر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ابھی اسے اپنے وفادار گدھے کے زخموں پر مرہم بھی لگانا تھا۔ اب بدھو نے ڈبو کی طرف دیکھا۔ اب بدھو کے پاس ڈبو کے سوال کا جواب موجود تھا۔

''یہاں وفا کا صلہ نہیں ملتا......؟'' ڈبو نے پوچھا تھا۔

''ضرور ملتا ہے۔ یہاں وفا کا صلہ ضرور ملتا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ جس کے ساتھ آپ نے وفا کی ہے۔ اسے آپ کی وفا کا شعور آ جائے۔ پھر وفا کا صلہ بھی مل جاتا ہے۔'' ☆☆☆

ماں کا قرض زندگی بھر نہیں اتارا جا سکتا

ایک بچہ ماں باپ کی پرورش سے پڑھ لکھ کر بہت بڑا آدمی بن گیا۔ والد کی وفات کے بعد ماں نے ہر طرح دکھ تکلیفیں سہہ کر اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ دُنیا میں جی سکے۔ بیٹے کی شادی کے بعد بیوی کو ماں سے شکایت ہونے لگی کہ وہ اس کے اسٹیٹس میں فٹ نہیں ہے۔ لوگوں کو بتانے میں انہیں حجاب محسوس ہوتا کہ یہ اَن پڑھ ان کی ماں ہے۔ ساس سے تلخ کلامی پر بیٹے نے ایک دن ماں سے کہا۔ ''ماں! میری آمدن اتنی ہے کہ میں زندگی کا کوئی بھی قرض ادا کر سکتا ہوں، اس لیے آج تم مجھ پر اب تک کیے گئے سارے اخراجات سُود سمیت ملا کر بتا دو تاکہ میں وہ ادا کر دوں۔ اس طرح میں اور تم دونوں الگ الگ ہنسی خوشی اور سکھ سے رہ سکیں گے۔''

ماں نے تھوڑا توقف کیا اور سوچ کر کہا۔ ''بیٹا! حساب ذرا لمبا ہے۔ سوچ کر بتانا پڑے گا، مجھے تھوڑا وقت چاہیے۔''

بیٹے نے کہا۔ ''کوئی جلدی نہیں، دو چار دنوں میں بتا دینا۔''

جب رات ہوئی تو سب سو گئے۔ ماں نے ایک لوٹے میں پانی لیا اور بیٹے کے کمرے میں آ گئی۔

بیٹا جہاں سو رہا تھا، اس کے ایک طرف پانی ڈال دیا۔ بیٹے نے جب کروٹ بدلی تو ماں نے دوسری طرف بھی پانی ڈال دیا۔ بیٹا جس طرف بھی کروٹ لیتا، ماں اسی طرف پانی ڈال دیتی۔ اچانک بیٹا پریشان ہو کر اُٹھ بیٹھا اور کھیج کر بولا۔ ''ماں تو یہ کیا کر رہی ہے؟''

ماں بولی: ''بیٹا تو نے مجھ سے پوری زندگی کا حساب مانگا ہے۔ میں ابھی یہ حساب لگا رہی تھی کہ میں نے کتنی راتیں تیرے بچپن میں تیرے بستر گیلا کر دینے سے جاگتے ہوئے کاٹی ہیں۔ یہ تو پہلی رات ہے اور تو ابھی سے گھبرا گیا......؟ میں نے تو ابھی حساب شروع بھی نہیں کیا ہے جسے تو ادا کر پائے۔''

ماں کی اس بات نے بیٹے کے دل کو بھینچ دیا۔ پھر وہ رات اس نے سوچنے میں ہی گزار دی۔ اسے احساس ہو گیا کہ ماں کا قرض زندگی بھر نہیں اُتارا جا سکتا۔

اَلْبَاطِنُ جَلَّ جَلَالُہٗ (پوشیدہ)

اَلْبَاطِنُ جَلَّ جَلَالُہٗ وہ ہے جسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ جو ساری مخلوق کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے، کیوں کہ وہ بلند شان والا ہے اور ہماری کم زور آنکھیں اسے نہیں دیکھ سکتیں۔ قرآن کریم میں یہ دونوں نام ایک ساتھ صرف ایک ہی مرتبہ آئے ہیں۔ سورج کتنا روشن اور ظاہر ہے۔ ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ سورج ہے اور یہ روشن ہے۔ ہر ایک اسے جانتا ہے، لیکن جب سورج خوب روشن ہو اور دمک رہا ہو تو اس کی ٹکیہ اتنی پوشیدہ ہے کہ اسے ہم اپنی آنکھوں سے نگاہ بھر کر نہیں دیکھ سکتے۔

اللہ تعالیٰ آنکھوں سے اتنے پوشیدہ ہیں کہ کوئی آنکھ انہیں دیکھ نہیں سکتی۔ ہاں! ان شاء اللہ تعالیٰ جنت میں اُن کی زیارت ضرور کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہمیں کچھ پتا ہے تو صرف وہی پتا ہے جو انہوں نے ہمیں علم دیا۔ ہم جہاں بھی ہوں، وہ ہمارے ساتھ ہیں۔ اب ذرا توجہ سے پڑھیے گا تو بات سمجھ میں آجائے گی۔

ایک مثال

ہمارا بھی ایک ظاہر ہے اور ایک باطن ہے۔ اگر کوئی مہمان ملنے آیا تو اس سے مسکرا کر ملنا، لیکن اندر ہی اندر سے دل میلا کرنا کہ اسے ابھی کام کے وقت آنا تھا یا رات کے وقت آنا اسے یاد آیا۔ مسکرا کر ملنا ہمارا ظاہر ہے اور اندر سے دل میلا کرنا ہمارا باطن ہے۔

دوسری مثال پڑھیے! اُستاد صاحب نے کلاس میں سمجھایا کہ جھوٹ نہیں بولنا تو اوپر سے کہہ دینا کہ نہیں بولیں گے۔ یہ ہمارا ظاہر ہے اور دل میں کہنا کہ جب بھی مشکل آ گئی اور جھوٹ بولنے سے چھٹکارہ نظر نہ آئے تو بول لیں گے تو یہ ہمارا باطن ہے۔

ہر طالب علم، طالبہ اور ہر مسلمان مرد و عورت کا ظاہر اور باطن ایک جیسا اور سنت کے مطابق ہونا چاہیے۔ جیسے کھلے چہرے کے ساتھ مسکرا کر ملیں تو اندر سے بھی ایسے ہی خوش ہوں۔

جویریہ آج بہت خوش تھی۔ اس کے ابو اس کے لیے ایک خوب صورت اسکول بیگ لے کر آئے تھے جس میں لنچ باکس اور جیومیٹری باکس رکھنے کی جگہ الگ الگ تھیں۔ پڑھنے لکھنے سے متعلق ہر ضروری چیزیں رکھنے کی الگ جگہیں بنی ہوئی تھیں۔ پہلے دن وہ بیگ اسکول لے کر گئی تو ساری سہیلیوں نے اس کے بیگ کی بہت تعریف کی۔

''امی! یہ بیگ مجھے بہت اچھا لگا اور اسکول میں میری سہیلیوں نے بھی اسے بہت پسند کیا۔'' دوپہر کو کھانا کھاتے ہوئے اس نے

امی سے کہا۔

''اچھا تو پھر آپ نے اس نعمت کے ملنے پر شکر ادا کیا۔'' امی نے پوچھا۔

''جی امی! میں نے پڑھا ہے۔''

''بہت اچھا! اچھے بچے اللہ تعالیٰ کی نعمت ملنے پر شکر ادا کرتے ہیں۔'' امی نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔ ☆☆☆

جویریہ شام کو ہوم ورک کرنے کے لیے بیٹھی۔ ساری کتابوں اور کاپیوں کو ایک ساتھ ہی نکال لیا اور جب رات کو اسے نیند آنے لگی تو جیسے تیسے کتابوں کو الٹ پلٹ کر کے بیگ میں ٹھونسا، صبح کو ناشتا ابھی مکمل کیا ہی نہیں تھا کہ اسکول وین آ گئی۔ وہ جلدی سے نامکمل ناشتے کے ساتھ وین کی طرف لپکی۔

''جویریہ! یہ بیگ کس قدر خوب صورت ہے؟'' حمنہ نے اس کے بیگ کو پہلی مرتبہ ہی دیکھتے ہوئے کہا۔

''حمنہ! ابو پرسوں ہی تو لائے ہیں، تم کل اسکول کیوں نہیں آئیں؟''

''بس جویریہ سستی ہوگئی، اب افسوس ہو رہا ہے کہ غیر حاضری نہ کرتی۔ اب کاپی فیئر کرنے کا مسئلہ بنے گا۔'' حمنہ نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا۔ یہ جملہ سنتے ہی جویریہ کچھ سوچنے لگی۔ اتنی دیر میں وین مکمل بھر چکی تھی۔ ساری طالبات آ چکی تھیں اور طالبات اپنی کتابیں اور کاپیاں کھول کر پڑھنے لگیں۔

''جویریہ سوچنے لگی کہ میں بھی کوئی کتاب نکال کر پڑھتی ہوں۔ اتنے میں اسے بیگ کی آواز سنائی دی: ''جویریہ تم نے میری ظاہری خوب صورتی کی طرف توجہ دی، مگر باطنی صفائی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔''

''کیا ظاہر اور کیا باطن؟'' وہ حیران ہو کر بولی، اسے ایسا لگا کہ جیسے اس نے یہ الفاظ پہلی مرتبہ سنے تھے۔

''ظاہری خوب صورتی یہی کہ تمہارے بیگ کو دیکھ کر ہر ایک نے تعریف کی ہے، کیوں کہ باہر سے بیگ بہت خوب صورت ہے، لیکن بیگ کے اندر سے تم نے ساری کتابیں بغیر کسی سلیقے کے ٹھونس رکھی ہے۔ یہ دیکھو حساب کی کتاب کے ورق مڑے ہوئے ہیں، اسلامیات کی کتاب اُلٹی رکھی ہے، اُردو کی کتاب کے ورق، سائنس کی کتاب میں گھس کر رہ گئے ہیں اور یہی حال ساری کاپیوں کا ہے۔ ان کی نئی نئی جلدیں مُڑ کر خراب ہوگئی ہیں۔ جیسا بیگ کا ظاہر ایسا ہی بیگ کا باطن ہو تب بات بنتی ہے۔''

اسکول بیگ کی باتیں سُن سُن کر وہ شرمندہ ہونے لگی۔

''اور ہاں! حمنہ تم سے ابھی ملی، دیکھنے میں تو تم اس سے خوش ہو کر ملی اور کیا اندر سے تم اس سے خوش ہو؟'' بیگ کا یہ سوال سن کر وہ چکرا گئی۔ جویریہ، حمنہ سے خوش نہیں تھی، کیوں کہ گزشتہ ہفتے، حمنہ نے اسے سائنس کی کاپی فیئر کرنے کے لیے نہیں دی تھی۔ اسے ابھی تک اس بات کا غصہ تھا۔

اس نے بھی یہی سوچ لیا تھا کہ آج حمنہ کو ساری کاپیاں فیئر کرنے کے لیے میری کاپیوں کی ضرورت ہوگی تو میں بھی اسے ہرگز نہیں دوں گی۔'' اسکول بیگ کی بات سن کر وہ دل میں سوچنے لگی۔

''اف...... اوہو! میرے بیگ کی طرح میرا ظاہر اور باطن ایک جیسا نہیں ہے۔'' اس نے بیگ سے شرمندہ ہو کر کہا۔ ''تو اب اس کا کیا حل ہے؟ مجھے دو رنگی ہونا اچھا نہیں لگتا۔'' اس نے بیگ سے جھلا کر پوچھا۔

''اس کا حل یہی ہے کہ جب تم اسمبلی سے کلاس میں جاؤ تو اندر سے بیگ میں ساری کتابیں صحیح کر کے رکھو اور ہر کاپی کو بھی صحیح کرو تاکہ بیگ باہر کی طرح اندر سے بھی ویسے ہی لگے اور دل میں یہ بات بٹھا لو کہ حمنہ جب بھی کاپی مانگے گی تو اسے فوراً کاپی دے دینا۔ اس طرح تمہارا دل اس سے صاف ہو جائے گا۔'' بیگ نے اسے حل بتاتے ہوئے کہا۔ اس نے ''ہاں'' میں سر ہلایا۔ ☆☆☆

''ارے جویریہ! میں کل اسکول نہیں آئی تھی، مجھے اب ساری کاپیاں چاہیے ہوں گی تاکہ سارا فیئر کام کر لوں۔'' حمنہ نے اسے وین میں کہا تو وہ فوراً کہہ اُٹھی:

''ہاں! کیوں نہیں؟'' یہ جملہ کہہ کر جویریہ اپنا ظاہر اور باطن ایک جیسا کر چکی تھی۔

شیطانی خیال آئے تو......

شیطانی خیالات سے بچنے کے لیے یہ آیت پڑھ لیا کریں تو شیطانی خیالات سے حفاظت ہو جائے گی۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ

ترجمہ: وہی اللہ اوّل بھی ہیں اور آخر بھی، ظاہر بھی ہیں اور چھپے ہوئے بھی اور وہ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والے ہیں۔

☆☆☆

عباسی خلیفہ متوکل (۲۳۲ھ تا ۲۴۷ھ) کے دورِ خلافت میں ایک ادیب اور شاعر ابو العیناء کو بڑی شہرت ملی۔ اس کی قوت حافظہ غضب کی تھی۔ حاضر جوابی اور خوش طبعی میں کوئی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ اسے اپنے محل میں لے گیا اور اس سے پوچھا کہ ہمارے گھر کے بارے میں آپ کیا رائے رکھتے ہیں؟ اس نے جواب دیا: ''لوگوں نے دُنیا میں گھر بنائے ہیں لیکن آپ نے تو گھر میں دُنیا بنا لی ہے۔'' ایک اور موقع پر کسی نے اس سے پوچھا کہ کسی کے سوال کا خوب صورت جواب کیا ہوسکتا ہے؟ اس نے کہا: ''وہ جواب جو جھوٹے کو خاموش کرا دے اور سچے کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے۔''

ابو العیناء کی رہائش بصرہ میں تھی لیکن زندگی کے ایک موڑ پر اسے بصرہ سے بادل ناخواستہ ہجرت کرنی پڑی۔ آیئے اس ترک وطن کی کہانی اسی کی زبانی سنیں۔

''ایک دن میں نے بصرے کے بازار میں ایک غلام کو بکتے ہوئے دیکھا۔ اس کی قیمت تین دینار لگ رہی تھی۔ اس پر طرہ یہ کہ اس کا مالک اس کی تعریفوں کے پل باندھتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ اگر اس غلام کی ذہانت، عقل مندی، چستی اور چالاکی کو دیکھا جائے تو یہ تین سو دینار میں بھی سستا ہے۔ چوں کہ مجھے اپنی عقل و دانش پر ناز تھا، لہٰذا میں نے اس غلام کو جانچنے کے لیے خرید لیا اور اسے گھر لے آیا۔ انہیں دنوں میرا مکان زیرِ تعمیر تھا۔ شام کے وقت میں نے غلام کو بیس دینار دیے کہ مکان پر کام کرنے والے راج مزدوروں کو ان کی اُجرت دے دو۔ اس اللہ کے بندے نے یہ کام کیا کہ محنت کشوں کو صرف دس دینار دیے اور باقی دس دیناروں کے بازار جا کر اپنے لیے کپڑے خرید لایا۔ میں نے ذرا سختی سے باز پرس کی تو مجھ سے الجھنے لگا اور کہنے لگا: آقا! نرمی کیجیے، بڑے لوگ غلاموں پر غصہ نہیں اُتارتے، بلکہ شفقت کا برتاؤ کیا کرتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ میں تو کسی اصمعی (عرب کا ایک ذہین ترین شخص تھا جس کی ذہانت ضرب المثل بن گئی ہے) کو خرید لایا ہوں۔ انہیں دنوں میں نے ایک خفیہ شادی کی ہوئی تھی، جس کی خبر پہلی بیوی کو تھی نہ رشتہ داروں کو، لیکن میں نے اس نوخرید شدہ غلام کو دوسری بیوی کے بارے میں بتایا کہ گھر کے کام کاج میں اور بازار سے سودا سلف لانے میں آسانی رہے۔ ایک دن میں نے غلام کو ایک دینار دیا اور ضرورت کی اشیاء کی فہرست پکڑائی۔ ان اشیاء میں ایک چیز ہازبی مچھلی بھی تھی جو اعلیٰ نسل کی شمار ہوتی تھی اور دوسری مچھلیوں سے مہنگی فروخت ہوتی تھی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ تمام اشیاء دیکھ بھال کر خریدنا کہیں کوئی ناقص چیز مہنگے داموں

میں نہ آ جائے۔ پھر یہ سارا سامان دوسری بیوی کے گھر دے دینا۔ اس نے جی حضور کہا اور چل دیا۔ بازار جا کر اس نے باقی اشیاء تو عمدہ خریدیں لیکن مچھلی کے معاملے میں ہیرا پھیری سے کام لیا، یعنی بازبی کی جگہ ایک عام اور سستی سی مچھلی خریدی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح اس نے کچھ رقم بچا کر اپنی جیب میں ڈالی۔ مجھے جب اس کی اس خیانت کا علم ہوا تو میں نے ناراضی کا اظہار کیا۔ میری خفگی کو دیکھ کر کہنے لگا کہ بقراط حکیم نے بازبی مچھلی کو انسانی صحت کے لیے مضر بتایا ہے، اسی لیے میں نے یہ مچھلی نہیں خریدی ورنہ آپ لوگ بیمار ہو جاتے۔ اس کی اس منطق پر مجھے سخت غصہ آیا۔ میں نے بھنا کر کہا: ''مجھے علم نہیں تھا کہ میں حکیم جالینوس کو خرید رہا ہوں۔'' میں نے چھڑی اُٹھائی اور اس کے دس ضربیں لگا دیں۔ اس نے بھی پھرتی دکھائی، میرے ہاتھ سے چھڑی چھین کر مجھے سات جڑ دیں اور کہنے لگا: ''آقا! غلام کو سبق سکھانے کے لیے تین ضربیں کافی ہوتی ہیں۔ آپ نے سات ضربیں زائد مار کر مجھ پر زیادتی کی ہے جس کا میں نے بدلہ لے لیا ہے۔'' اس کی زبان درازی جلتی پر تیل کا کام کر گئی۔ میرا غیظ و غضب انتہا کو جا پہنچا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ بس اس پر پل پڑا۔ اللہ دے اور بندہ لے، میں نے اسے مار مار کر لہولہان کر دیا۔ میری بھڑاس نکل چکی تو وہ جان چھڑا کر بھاگا اور سیدھا میری دوسری بیوی کے گھر جا دھمکا۔ وہاں جاتے ہی اس نے میرے خلاف شکایتوں کا دفتر کھول دیا، کہنے لگا: ''اسلام خیر خواہی کا نام ہے، جو شخص دوسروں کو دھوکا دیتا ہو وہ مسلمان نہیں رہتا۔ میرے آقا نے خفیہ طور پر تیسری شادی کر رکھی ہے۔ مجھے جوں ہی اس کی بھنک پڑی تو میں نے آپ کی طرف داری کرتے ہوئے زبان کھولی۔ میں نے آقا کو صاف صاف کہہ دیا کہ انہوں نے تیسری شادی کر کے اچھا نہیں کیا۔ اس نکاح سے میری مالکن کی حق تلفی ہوئی ہے۔ میری یہ صاف گوئی انہیں بُری لگی۔ میری کھری کھری باتیں سن کر ان کے تن بدن میں مارے غصے کے آگ لگ گئی اور انہوں نے مجھے روئی کی طرح دھنک ڈالا۔'' غلام نے اپنی آپ بیتی نمک مرچ لگا لگا کر اور آنسو بہا بہا کر کچھ اس انداز سے بیان کی اور سسک سسک کر اپنا زخمی جسم کچھ اس ادا سے دکھایا کہ مالکن کے بے اختیار آنسو چھلک پڑے۔ عورت ذات غلام کی چرب زبانی کو نہ سمجھ سکی بلکہ اُلٹا مجھے کوسنے لگی۔ اس نے میری طرف پیغام بھیجا کہ آپ آئندہ میرے گھر قدم رنجہ نہ فرمائیں بلکہ مجھے طلاق دے دیں۔ کچھ عرصہ ہم دونوں میاں بیوی کے درمیان ناچاقی رہی۔ آخر تنگ آ کر میں نے اسے طلاق دے دی اور فتنہ پرداز غلام کو بھی آزاد کر دیا، لیکن اس نے آزاد ہو کر بھی میرا پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن کہنے لگا کہ میں اسے حج پر بھیج دوں۔ میں نے اسے زادِ راہ دے کر حج کے لیے روانہ کر دیا۔ بیس دنوں کے بعد وہ مکار واپس آ گیا اور یہ رام کہانی سنائی کہ راستے میں حجاج کرام کے قافلے پر ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا تھا اور ان کے پاس جو کچھ تھا، سب لوٹ کر لے گئے۔ وہ بڑی مشکل سے جان بچا کر واپس آیا ہے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد کہنے لگا کہ اگر اس کی آخری خواہش پوری کر دی جائے تو پھر وہ مزید تنگ نہیں کرے گا اور یہ خواہش جہاد میں شریک ہونے کی تھی۔ میں نے اسے سامانِ جنگ سے مسلح کر کے جہاد کے لیے بھیجا۔ اس کے بعد اپنی جائیداد بیچی اور اپنے گھر کا سامان وغیرہ باندھ کر بصرہ شہر ہی چھوڑ دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ عیار جہاد سے بھی زندہ سلامت واپس آ جائے اور غازی بن کر کہیں مجھ پر ہی حملہ نہ کر دے۔'' ☆☆☆

چھانگا مانگا

چھانگا مانگا لاہور سے 75 کلو میٹر کے فاصلے پر بین الاقوامی شہرت کا حامل مصنوعی جنگل ہے جسے دنیا کا سب سے بڑا مصنوعی جنگل قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا رقبہ 12510 ایکڑ پر محیط ہے۔ اس جنگل کو 1886ء میں لگانا شروع کیا گیا تھا۔ اس کا شمار قدیم ترین نہری جنگلوں میں کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد ریلوے انجن کے لیے ایندھن فراہم کرنا تھا۔ 1888ء تک جنگل کے کافی حصے میں شیشم کے درخت اور کچھ عرصہ بعد توت اور بانس کے درخت بھی لگائے گئے۔ شروع شروع میں کنوئیں کھود کر جنگل کو پانی فراہم کیا گیا۔ 1936ء میں ایشیاء اور چائنہ سے ہجرت کر کے آنے والے پرندوں کے لیے یہاں خاص طور پر درخت لگائے گئے تھے۔ 1960ء میں اسے قومی باغ بنا دیا گیا۔ سیاحوں کی تفریح کے لیے مہتابی جھیل، چڑیا گھر، کشتی رانی، سوئمنگ پول، لکڑی کے بنے ہٹ، مہتاب محل، کرکٹ گراؤنڈ، چلڈرن پارک کے علاوہ دیگر عمارات بھی بنائی گئیں جن میں ریسٹ ہاؤس وغیرہ بھی شامل ہیں۔

اس جنگل میں ہرن، نیل گائے، مور اور دوسرے جانور پائے جاتے ہیں جن کا شکار ممنوع ہے۔ سب سے دل چسپ یہاں بھاپ سے چلنے والا وہ انجن ہے جو اب کہیں اور نظر نہیں آتے۔ یہ صرف چھانگا مانگا میں چل رہے ہیں۔ فاریسٹ پارک کا رقبہ 153 ایکڑ ہے۔ پارک میں خوب صورت کینٹے میریا بھی ہے۔ یہاں کا ماحول عام جنگل کے ماحول سے ذرا مختلف ہے کیوں کہ اسے ایک پلاننگ کے تحت بنایا گیا ہے۔ چھانگا مانگا کے ریسٹ ہاؤس میں رات گزارنے کا اپنا ہی ایک مزہ ہے۔ مہم جو سیاح کے لیے یہ جنگل میں منگل سے کم نہیں ہے۔ نڈر اور دلیر قسم کے انسان رات کو جنگل کی سیر کرنے نکل جاتے ہیں۔ جہاں کئی مقامات پر مختلف جانوروں کی آوازیں ان کے قدم روک دیتی ہیں۔ جنگل کی سیر کرنے کے لیے صبح کا وقت انتہائی مناسب ہے جہاں قدرتی ماحول کو دیکھ کر انسان اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے ہمیں کیسی کیسی نعمتوں سے نوازا ہے۔ لاہور سے باہر رہنے والے جب بھی لاہور کی سیر کا پروگرام بنائیں تو اپنے شیڈول میں چھانگا مانگا کو سرفہرست رکھیں ورنہ آپ حسین قدرتی جنگلات کے نظاروں سے محروم رہیں گے۔

اپنے ملک کو صاف رکھیں!

آصف اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ ایک صاف ستھرے علاقے میں رہتا تھا۔ وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا۔ یہ ایک کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ بچوں کے والدین صاف ستھرا گھر پسند کرتے تھے، اس لیے اپنے گھر میں صفائی کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آصف کی امی نے گھر کے ہر کمرے میں ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ بچوں کے دادا، دادی بھی بے حد صفائی پسند تھے۔

آصف بہت ذہین تھا۔ ہر سال اچھے نمبر لے کر پاس ہوتا تھا مگر پرلے درجے کا شرارتی بھی تھا۔ اس میں دو خامیاں تھیں۔ ایک تو بہت ضدی تھا، کسی کا کہنا نہیں مانتا تھا۔ دوسرے صفائی پسند نہیں تھا۔ اس کی ان عادتوں کی وجہ سے اس کے والدین سخت پریشان تھے۔ جب بھی کھانے کی میز پر آتا، کھانا کھاتے وقت میز گندی کر دیتا تھا۔ اس کی امی اسے منع کرتی رہتیں مگر وہ صفائی ستھرائی کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ اس کی امی اسے ہمیشہ ٹوکتی رہتی تھیں اور کہتی تھیں کہ میرے باقی بچے بھی اتنے گندے ہوتے تو میرا کیا حال ہوتا؟ آصف اپنی ان عادتوں کو ختم کرنے کی بجائے ان لوگوں سے ناراض ہو جاتا تھا۔ وہ جب بھی کوئی پھل کھاتا، اس کے چھلکے زمین پر پھینک دیتا تھا۔ چھلکے کوڑے کی ٹوکری میں پھینکنے کی زحمت نہیں کرتا تھا۔ چھٹی کے دن جب صحن میں بیٹھ کر پھل کھاتا تھا تو کوئی چھلکا دائیں طرف اور کوئی بائیں طرف پھینک دیتا تھا۔

اتوار کا دن تھا اور اسکول سے چھٹی تھی۔ اسکول سے بھی کوئی خاص کام نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنے دوستوں کے ساتھ پارک کی سیر کا پروگرام بنایا۔ وہ اپنی امی کو بتا کر دوستوں کے ساتھ سیر کے لیے چلا گیا۔ گھر سے اس نے پھل لے لیے تھے۔ پارک میں تھوڑی دیر کھیلنے کے بعد اسے بھوک لگنے لگی۔ اس نے ٹوکری سے کیلے نکالے اور کھانے لگا۔ اس نے اپنے دوستوں کو بھی کیلے کھانے کے لیے دیے۔ آصف کیلے کے چھلکے لاپرواہی سے زمین پر پھینک رہا تھا جب کہ اس کے دوستوں نے چھلکے ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے کہ کہیں کوڑے کی ٹوکری نظر آئے تو اس میں ڈال دیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ایک کیاری کے پاس پہنچے تو ان کی نظر ایک شخص پر پڑی، اس کی عمر پچاس سال کے قریب ہوگی۔ وہ نرم نرم گھاس پر بیٹھا لوگوں کو اِدھر اُدھر آتے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ آصف جب اس شخص کے پاس سے گزرا تو اس نے بے دھیانی میں چھلکا نیچے پھینکا جو سیدھا اس شخص کی جھولی میں جا گرا۔ آصف کے ایک دوست نے اس شخص سے معذرت کر لی لیکن اس نے معذرت قبول کرنے کی بجائے انہیں اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ سب ڈر رہے تھے کہ یہ شخص ان کو بُرا بھلا کہے گا مگر اس نے بڑے نرم لہجے میں انہیں

سمجھایا کہ چھلکے اس طرح نہیں پھینکنے چاہئیں، انہیں ہمیشہ کوڑے کی ٹوکری میں ڈالنا چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ گھر صاف کر کے گند گلی میں پھینک دو۔ ہمیں کہیں جانے کے لیے گلیوں اور بازاروں سے گزرنا پڑتا ہے جنہیں ہم کوڑے کرکٹ سے بھر دیتے ہیں، پھر بارش کی صورت میں یہ گلیاں گندے پانی کے جوہڑوں میں بدل جاتی ہیں۔ ہمیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ گھر اور اسکول ہمارا ہے اور ہمیں صرف اسی کو صاف رکھنا ہے بلکہ ہمیں اپنے پورے ملک کو صاف رکھنے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ یہ گھر، اسکول، پارک، شہر، سڑکیں اور یہ ملک آپ کا ہے، انہیں صاف ستھرا رکھیں۔

ہمارے بڑوں نے بہت سی قربانیاں دے کر یہ ملک حاصل کیا ہے، اب اس وطن کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اگر ہمارا ماحول گندا ہوگا تو گندگی سے بیماریاں پھیلیں گی اور ہم بیمار ہو جائیں گے اور بیمار قومیں کبھی ترقی نہیں کر سکتیں۔ ترقی کرنے کے لیے ہم سب کا تن درست اور صحت مند ہونا بہت ضروری ہے۔

آصف نے ان باتوں سے اُکتاتے ہوئے اپنے دوستوں سے کہا۔ ''آؤ بھئی! ہم سیر کرنے آئے ہیں، کسی کی تقریر سننے نہیں آئے۔'' وہ شخص آصف کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ بہرحال آصف اور اس کے دوستوں نے پارک کی خوب سیر کی۔ اب شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا۔ ان لوگوں نے باہر نکلنے کے لیے تیز تیز قدم اُٹھائے، تیز چلتے ہوئے آصف کا پاؤں کیلے کے چھلکے پر آ گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر گیا۔ وہ زور سے چلایا۔ ''ہائے میری ٹانگ۔'' اتفاق سے وہ شخص بھی پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے آصف کو بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ درد کی شدت سے چلا رہا تھا۔ پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ اس کے دوست اس شخص کی مدد سے آصف کو باہر لائے۔ خوش قسمتی سے باہر اسی شخص کی گاڑی کھڑی تھی۔ اس نے آصف کو اور اس کے دوستوں کو گاڑی میں بٹھا کر اسپتال پہنچایا۔

وہاں ڈاکٹروں نے آصف کو فوراً ٹیکے لگائے جس سے تھوڑی دیر میں اسے ہوش آ گیا۔ اس کے درد میں بھی کمی ہوئی۔ ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے بتایا کہ آصف کی ٹانگ ٹوٹ چکی ہے۔ اس کے دوستوں نے آصف کے گھر فون کر کے اس کے والدین کو اطلاع دی۔ وہ فوراً اسپتال پہنچ گئے۔ پارک والا شخص انہیں خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔ آصف کو کئی روز اسپتال میں رہنا پڑا۔ پھر جب گھر آیا تو اس کی ٹانگ پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ آصف اب پارک والے شخص کی نصیحتوں کو یاد کر رہا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ اس نے ان پر عمل کیوں نہ کیا۔ اس نے اپنی امی کو سارا قصہ سنایا۔

امی نے کہا۔ ''تمھیں تو میری باتیں بُری لگتی تھیں، اسی لیے تمہیں کہنا نہ ماننے کی سزا ملی ہے۔'' آصف بہت شرمندہ تھا، اس نے امی سے کہا۔ ''واقعی میں غلطی پر تھا۔ اب میں آئندہ اپنا گھر ہی نہیں بلکہ جس جگہ بھی رہوں گا، اس کی صفائی کا خیال رکھوں گا۔ یہ ملک ہمارا ہے، ہمیں اپنے ملک کی صفائی کا خیال رکھنا چاہیے، یہ مصیبت میرے گند ڈالنے کی وجہ سے آئی ہے۔ مجھے اب اس شخص کی باتوں کی سمجھ آئی ہے۔ وہ صحیح کہہ رہا تھا۔

''مگر اب سمجھنے کا کیا فائدہ؟'' آصف کی امی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''چلو خیر جو ہوا سو ہوا، اب تم بڑوں کی نصیحتوں پر عمل کرنا، تمہاری زندگی بہتر ہو جائے گی۔''

آصف نے جواب دیا۔ ''امی اب میں بڑوں کی نصیحتوں پر عمل کروں گا، ان کی باتیں غور سے سنا کروں گا۔'' اس کی امی اس کے منہ سے اتنی اچھی باتیں سن کر بہت خوش ہوئیں۔ انہیں آصف کے زخمی ہونے کا بہت دکھ تھا لیکن اس کے راہ راست پر آ جانے کی خوشی اس سے زیادہ تھی۔ انہوں نے اسے جلدی صحت یاب ہونے کی دعا دی۔

آخر ایک دن ایسا آیا جب وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔ سب بہن بھائی اور والدین بہت خوش تھے۔ اب اس نے ایک نئی زندگی شروع کر دی۔

☆☆☆

ایبولا وائرس بیماری

یہ انسانوں اور دودھ پلانے والے جانوروں میں ایبولا وائرس کے ذریعے پھیلتی ہے۔ ایبولا بیماری کی علامات دو دن سے تین ہفتوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اس کی ابتدائی علامات میں بخار، گلے کی سوجن، جوڑوں اور پٹھوں میں درد و کھچاؤ کے ساتھ سر میں شدید درد شامل ہیں۔ ایبولا مرض کی شدید علامات میں اُلٹی، اسہال اور گردوں و جگر کی ناقص کارکردگی ہے۔ ڈاکٹر حضرات اس مرض کے آغاز میں ہی LFT اور گردوں کی کارکردگی کے لیے Urea, Critinine, Electrolytes کا ٹیسٹ تجویز کرتے ہیں۔ ایبولا مرض کی آخری علامت جسم کے اندرونی و بیرونی حصوں سے خون رِسنا ہے۔ ایبولا مرض متاثرہ مریض، جانور کے خون سے براہ راست یا جسمانی رطوبتوں جس میں پسینہ، تھوک وغیرہ شامل ہیں، سے پھیلتا ہے۔ ہوا، پانی سے ایبولا مرض کا پھیلاؤ ممکن نہیں، تاہم چمگادڑ اس وائرس کے پھیلاؤ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے کیوں کہ جب یہ چمگادڑ جانوروں پر حملہ کرتی ہیں یا بھینس، گائے کو کاٹتی ہیں اور انسان ان جانوروں کا گوشت کھاتا ہے اور دودھ پیتا ہے تو یہ وائرس انسان کے جسم میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایبولا وائرس لگنے کے تین ماہ تک خواہ وہ مرد ہو یا عورت ایبولا دوسرے لوگوں میں پھیلتا رہتا ہے۔

نمازوں کے اوقات اور رکعتوں کی تعداد

نمبر شمار	نماز	رکعتیں	تعداد	مقررہ اوقات
1	نماز فجر	دو سنت موکدہ[1]، دو فرض	4	پو پھٹنے سے، سورج نکلنے سے پہلے تک۔
2	نماز ظہر	چار سنت موکدہ، چار فرض دو سنت موکدہ، دو نفل	12	دوپہر کے ڈھلنے سے اس وقت تک جب ہر چیز کا سایہ اس کا اصلی سایہ[2] ہو۔
3	نماز عصر	چار سنت غیر موکدہ، چار فرض	8	نماز ظہر کا وقت ختم ہونے سے سورج کے غروب ہونے سے پہلے تک۔
4	نماز مغرب	تین فرض، دو سنت موکدہ، دو نفل	7	سورج غروب ہونے کے بعد سفید شفق کے غائب ہونے سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک لیکن سورج غروب ہوتے ہی اس کا ادا کر لینا بہتر ہے۔
5	نماز عشاء	چار سنت غیر موکدہ، چار فرض، دو سنت موکدہ، دو نفل، تین وتر واجب، دو نفل	17	سفید شفق کے غائب ہونے سے صبح صادق تک۔
6	نماز جمعہ	چار سنت موکدہ، دو فرض چار سنت، دو سنت، دو نفل	14	ظہر کا وقت۔
7	عیدین	دو رکعت واجب	2	طلوع آفتاب کے بعد سے دوپہر تک۔

ہدایت:

1- صبح کی نماز میں سورج نکلنے تک سوائے دو سنت اور دو فرض کے کوئی اور نماز نفل یا سنت نہیں پڑھی جائے گی۔

2- نماز عصر پڑھ لینے کے بعد سورج غروب ہونے تک بھی کوئی نماز سنت یا نفل نہیں پڑھی جائے گی۔

3- سورج نکلنے، ڈوبنے اور سر پر آنے کے وقت، اوقات زوال کہلاتے ہیں۔ ان میں نماز پڑھنا ممنوع ہے۔

نفل نمازیں

نمبر شمار	نام نماز	رکعتیں	اوقات
1	تہجد	4 سے 12	آدھی رات سے صبح صادق سے پہلے تک
2	اشراق	2 سے 4	سورج نکلنے کے بعد
3	چاشت	2 سے 4	دس بجے کے قریب سورج ڈھلنے سے پہلے
4	اوابین	6 سے 20	نماز مغرب کے بعد
5	تراویح	8 سے 20	رمضان شریف میں عشا کی نماز کے بعد

نماز تراویح[3]

رمضان المبارک کے مہینے میں عشا کی نماز میں وتروں سے پہلے بیس رکعت سنت تراویح موکدہ باجماعت پڑھی جاتی ہیں۔ عام طور پر نماز تراویح میں سارے مہینے میں قرآن مجید ختم کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی حافظ قرآن نہ مل سکے تو چھوٹی چھوٹی سورتیں جو زبانی یاد ہوں، پڑھ کر نماز پڑھ لی جاتی ہے۔

ہر دو رکعت کے بعد سلام پھیر دی جاتی ہے اور ہر چار رکعت پڑھ چکنے کے بعد ذیل کی تسبیح تراویح پڑھی جاتی ہے۔

سُبْحَانَ ذِی الْمُلْکِ وَالْمَلَکُوْتِ ط سُبْحَانَ ذِی الْعِزَّۃِ وَالْعَظَمَۃِ وَالْھَیْبَۃِ وَالْقُدْرَۃِ وَالْکِبْرِیَآءِ وَالْجَبَرُوْتِ ط سُبْحَانَ الْمَلِکِ الْحَیِّ الَّذِیْ لَا یَنَامُ وَلَا یَمُوْتُ ط سُبُّوْحٌ قُدُّوْسٌ رَبُّنَا وَرَبُّ الْمَلٰٓئِکَۃِ وَالرُّوْحِ ط اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ ط یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ یَا مُجِیْرُ ط

ترجمہ: پاک ہے جو ملک اور بادشاہت والا ہے۔ پاک ہے وہ جو عزت والا اور عظمت والا اور ہیبت والا اور قدرت والا اور بڑائی والا، اور صاحب جبر ہے۔ پاک ہے وہ جو بادشاہ ہے زندہ رہنے والا ایسا کہ نہ اس کے لیے نیند ہے اور نہ موت۔ وہ بے انتہا پاک ہے اور بے انتہا مقدس ہے۔ وہ ہمارا رب اور فرشتوں اور جبرئیل کا رب ہے۔ الٰہی! ہمیں آگ سے بچانا۔ اے بچانے والے! اے پناہ دینے والے۔ اے نجات دینے والے۔ اس کے بعد درود شریف پڑھے۔

نماز وتر

اس میں تین رکعتیں ہوتی ہیں۔ دو رکعتیں پڑھ کر قعدہ کیا جائے اور التحیات پڑھ کر کھڑے ہو جائیں اور تیسری رکعت میں الحمد و سورت کے بعد ہاتھ اُٹھا کر تکبیر کہی جائے اور ہاتھ باندھ کر دعائے قنوت پڑھی جائے۔

دعائے قنوت: اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْتَعِیْنُکَ وَنَسْتَغْفِرُکَ وَنُؤْمِنُ بِکَ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْکَ وَ نُثْنِیْ عَلَیْکَ الْخَیْرَ وَنَشْکُرُکَ وَلَا نَکْفُرُکَ وَنَخْلَعُ وَنَتْرُکُ مَنْ یَّفْجُرُکَ ط اَللّٰھُمَّ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَلَکَ نُصَلِّیْ وَنَسْجُدُ وَاِلَیْکَ نَسْعٰی وَ نَحْفِدُ وَ نَرْجُوْا رَحْمَتَکَ وَ نَخْشٰی عَذَابَکَ اِنَّ عَذَابَکَ بِالْکُفَّارِ مُلْحِقٌ ط

ترجمہ: اے اللہ ہم مدد چاہتے ہیں تجھ سے اور معافی چاہتے ہیں تجھ سے اور ایمان لائے ہیں تجھ پر اور بھروسہ رکھتے ہیں تجھ پر اور تعریف کرتے ہیں تیری اچھی اور شکر کرتے ہیں اور ناشکری نہیں کرتے ہم تیری اور ہم اس سے علیحدہ ہوتے ہیں اور بیزار ہیں جو نافرمانی کرتے ہیں تیری۔ اے اللہ! تیری ہی ہم عبادت کرتے ہیں اور تیرے ہی لیے نماز پڑھتے ہیں اور سجدہ کرتے ہیں اور تیری طرف دوڑتے ہیں اور تیرے دربار میں حاضر ہوتے ہیں اور امیدوار ہیں تیری رحمت کے اور ڈرتے ہیں تیرے عذاب سے، بیشک تیرا عذاب کافروں کو ملنے والا ہے۔

---

1. سنتیں دو طرح کی ہیں۔ موکدہ اور غیر موکدہ۔ موکدہ سنتوں کو چھوڑنے سے آدمی گنہگار ہوتا ہے لیکن غیر موکدہ سنت کو چھوڑ دینا گناہ نہیں۔
2. ہر چیز کا کم سے کم سایہ جو زوال کے وقت ہو، اس کا اصلی سایہ کہلاتا ہے۔ یہ ہر موسم میں مختلف ہوتا ہے۔
3. رمضان شریف میں تراویح کے بعد وتر باجماعت پڑھے جاتے ہیں۔

ٹھکانہ قبر ہے عبادت کچھ تو کر غالبؔ
کہاوت ہے کسی کے گھر خالی ہاتھ جایا نہیں کرتے

(طوبیٰ وحید، ہری پور)

سچ کو تحریروں میں پاؤ گے، نہ تقریروں میں
سچ کہیں ہے تو وہ ہے سینوں میں انسانوں کے

(ایمان زہرہ، لاہور)

پھول کھلنے کی خوشی میں مسکرائی تھی کلی
کیا خبر تھی یہ تغیر موت کا پیغام بنی

(رانا بلال احمد، کوٹلہ جام)

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

(عبدالجبار رومی انصاری، لاہور)

اک مدت سے میری ماں سوئی نہیں تابش
میں نے اک بار کہا تھا، مجھے ڈر لگتا ہے

(فتح محمد شارق، نوشہرہ)

میری لاج رکھ لے میرے خدا
یہ تیرے حبیبؐ کی بات ہے

(ابوبکر صدیق)

کیوں منتیں مانگتا ہے اوروں کے دربار سے اقبال
وہ کون سا کام ہے جو ہوتا نہیں تیرے دربار سے

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری تحقیر ہوتی ہے
میں مسجود ملائک ہوں مجھے انسان رہنے دو

(خولہ اسلم، ملکوال)

اے پروردگار یہ تیرا فضل ہے اور میری خوش نصیبی
کہ جب بھی تیری بارگاہ میں ہاتھ اُٹھائے خالی نہ گئے

(فیضان احمد فیضی، حضرو اٹک)

سو حوادث سے اُلجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پر اشک برسانا نہیں آتا

(عائشہ صدیقہ، جہلم)

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

(عبیرہ شاہد، امیرہ شاہد، گجر خان)

جب اپنا قافلہ عزم و یقیں سے نکلے گا
جہاں سے چاہیں گے، رستہ وہیں سے نکلے گا

(محمد قمر الزمان صائم، خوشاب)

تیری رحمتوں پہ ہے منحصر میرے ہر عمل کی قبولیت
نہ مجھے سلیقۂ التجا نہ مجھے شعورِ نماز ہے

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

جن کو ہوتی ہے زمانے میں بہاروں کی تلاش
زندگی ان کی ہی کانٹوں پہ بسر ہوتی ہے

(عبداللہ شاہ، دریا خان)

تم ہی خلوص دل سے آ جاتے ہو شعور اب
ملتا ہے کون ورنہ بے فائدہ کسی سے

(عتیقہ رحیم، جوہر آباد)

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
سدا عیشِ دوراں دکھاتا نہیں

(آمنہ شاہ، دریا خان)

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

(حفصہ احمد، گجرات)

وہی لوگ پاتے ہیں عزت زیادہ
جو کرتے ہیں زندگی میں محنت زیادہ

(کرن فاروق، گوجرانوالہ)

اس قید کا الٰہی دکھڑا کسے سناؤں
ڈر ہے یہیں قفس میں، میں نہ مر جاؤں

(مزمل علی جعفری، سعید آباد)

فضا کے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اتر سکتے ہیں قطار اندر قطار اب بھی

(محمد احمد خان غوری، بہاول پور)

پیارے بچو! قائداعظمؒ نہایت نفیس اور شائستہ انسان تھے۔ ان کی عادات اور پسندیدگی میں خود اعتمادی کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایک متاثر کن، مقبول اور پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ان کی سب سے اچھی عادت وقت کی پابندی تھی۔ اسی خوبی کے باعث حصولِ پاکستان کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ وہ ٹھیک سات بجے بیدار ہو کر چائے پیتے۔ تقریباً ایک گھنٹہ اخبار کا مطالعہ کرتے، اس کے بعد فاطمہ جناح کے ساتھ ناشتہ کرتے اور ٹھیک دس بجے روزمرہ کی مصروفیات کا آغاز ہو جاتا تھا۔

قائداعظم سے ملاقات: قائداعظم سے ملاقات کا وقت پہلے سے طے شدہ ہوتا تھا اور اس کا اندراج ایک ڈائری میں ہوتا تھا۔

خط و کتابت: قائداعظم اپنے خطوط خود کھولتے تھے۔ منی آرڈر اور رجسٹرڈ خطوط بھی خود ہی وصول کرتے تھے۔ خط کا مطالعہ کرنے کے بعد ان کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کا جواب فوری طور پر لکھ کر روانہ کیا جائے۔

پسندیدہ لباس: قائداعظم ایک طویل عرصے تک کوٹ پتلون پہنتے رہے مگر شیروانی اور شلوار کا استعمال انہیں بہت پسند تھا اور وہ بڑے اہتمام سے شیروانی سلواتے تھے۔ 1937ء میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے جلسے میں پہلی بار ٹوپی پہنی جسے بہت پسند کیا گیا۔ بعد میں یہ ٹوپی ان کی شخصیت کا لازمی حصہ بن گئی۔ اس لیے اسے جناح کیپ کہا جاتا ہے۔

پسندیدہ شہر: قائداعظم کو بمبئی اپنی علمی، ادبی، سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے بے حد پسند تھا۔

پسندیدہ مشغلہ: قائداعظم کا پسندیدہ کھیل کرکٹ تھا۔ زمانۂ طالب علمی میں وہ اکثر شام کے اوقات میں اسکول کے ایک دوست کریم قاسم کے ساتھ گھڑسواری کے لیے جاتے تھے۔ قائداعظم بلیئرڈ کے بھی شوقین تھے۔ اس کے علاوہ قائداعظم گالف بھی کھیلتے تھے۔ قائداعظم کی ذاتی اشیاء کے حوالے سے قائم ''ایوانِ نوادرات قائد'' میں گالف کھیلنے کا سامان محفوظ ہے۔

پسندیدہ رنگ: قائداعظم کی زندگی کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ انہیں سیاہ اور سفید رنگ زیادہ پسند تھا۔

پسندیدہ کتب: قرآنِ پاک اور سیرت النبیؐ کے علاوہ مشاہیر عالم کی سوانح عمریوں سے انہیں خاصی دل چسپی تھی۔

پسندیدہ خوراک: قائد کم مگر اہتمام کے ساتھ کھاتے تھے۔ انہیں سادہ غذا مثلاً اُبلی ہوئی سبزیاں اور دالیں پسند تھیں۔ کبھی کبھار پلاؤ بھی شوق سے کھاتے تھے۔

پسندیدہ اخبار: ڈان، پاکستان ٹائمز۔

پسندیدہ مشروب: قائداعظم کا پسندیدہ مشروب چائے اور کافی تھا لیکن ان کے استعمال میں بھی وہ توازن اور اعتدال کا بہت خیال رکھتے تھے۔

پسندیدہ عمارتیں: قائداعظم کو اسلامی فنِ تعمیر سے دل چسپی تھی۔ اس لیے گنبدوں اور میناروں والی عمارتیں انہیں بہت پسند تھیں۔ خاص طور پر وہ میناروں کو بلندی وعظمت اور ہمت کا پیغام سمجھتے تھے۔

پسندیدہ جانور: قائداعظم کا پسندیدہ جانور گھوڑا تھا۔ ان کے خیال میں گھوڑا جس طرح سر اونچا کر کے دوڑتا ہے، اس سے اس کی خوداعتمادی اور اندرونی قوت کا پتا چلتا ہے۔

پسندیدہ مذہب: قائداعظم اسلام کو دینِ فطرت اور اسلامی اصولوں کو دُنیا و آخرت میں ترقی اور کامیابی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔ وہ عبادت میں بھی نظم وضبط کے قائل تھے۔ 1946ء میں لندن کے قیام کے دوران وہ مشرقی لندن کی ایک مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ قائداعظم کو آخری صف میں جگہ ملی۔ قائد کے ساتھیوں نے پہلی صف میں پہنچنے کے لیے جگہ بنانے کی کوشش کی تو انہوں نے فرمایا: ''نہیں میری جگہ یہیں ہے۔'' چنانچہ قائداعظم نے آخری صف میں نماز جمعہ ادا کی۔

ہمارے پیارے قائداعظم محمد علی جناح بچوں سے بہت محبت کرتے تھے۔ بہت سے ایسے بچے جو قائداعظم محمد علی جناح سے ان کی زندگی میں ملے، وہ ملاقات کو کبھی فراموش نہ کرسکے۔ چھوٹے بچوں سے قائداعظم بہت ہی محبت کرتے تھے۔ ان کے آس پاس بچے ہوتے تو وہ سب کچھ بھول کر انہیں میں کھو جاتے اور بچوں کی معصوم حرکتوں سے دل بہلاتے۔

اپنی اکلوتی بیٹی دینا جناح سے بھی ان کو بہت پیار تھا۔ وہ ایک باپ اور شفیق انسان تھے۔ کبھی کبھی وہ پُرانے صندوق سے اپنی بیٹی کے چھوٹے چھوٹے کپڑے نکلوا کر خاموشی سے دیکھا کرتے تھے۔

قائداعظم سیاسی مصروفیات کے باوجود بچوں سے ملنے کا وقت نکال لیتے، بچوں کے لیے ان کا پیار جاگ اُٹھتا اور وہ کچھ دیر کے لیے ان کے ساتھ گھل مل کر لطف اندوز ہوتے۔

کوئٹہ میں ایک موقع پر جلوس کے ہمراہ قائداعظم بازار سے گزر رہے تھے کہ ایک مکان کی چھت پر کھڑے دو بچوں نے اپنے قائد کو پہچان لیا۔ وہ خوشی سے قائداعظم قائداعظم پکارنے لگے۔ قائداعظم نے بچوں کو دیکھ کر ان کی طرف ہاتھ لہرا دیا۔ مسکراتے بچوں نے خوشی سے کار میں دو سنگترے تحفہ کے طور پر پھینکے قائداعظم نے انہیں اُٹھایا اور شکریہ کے طور پر دُور تک اپنا ہاتھ بچوں کو دیکھ کر لہراتے رہے۔ انہوں نے راستہ بھر بچوں کا تحفہ اپنے ہاتھوں میں اُٹھائے رکھا۔

کھوج لگائیے میں حصہ لینے والوں کے نام

عارفہ شیخ، اسلام آباد۔ مشعال آصف، لاہور۔ ارسلان الدین، کراچی۔ عمر عبدالرحمٰن، لاہور۔ حسن احمد، بہاول نگر۔ حافظ حسان طاہر، پاک پتن شریف۔ طوبیٰ راشد، لاہور۔ ابوالحسن مبشر، بھلوال۔ سید اشہد بخاری، دریا خان۔ مہر اکرم، لاہور۔ محمد حسنین ندیم، اٹک۔ نمرہ ناز، راول پنڈی۔ تحریم احمد، واہ کینٹ۔ گلاب خان سونگی، راول پنڈی۔ وقاص افضل، جھنگ صدر۔ محمد عون عبداللہ، واہ کینٹ۔ حمزہ خوشنود، لاہور۔ ریبا فاطمہ، سیال کوٹ۔ قاری محمد ندیم عطاری، اوکاڑہ۔ عائشہ صدیقہ، پشاور۔ ام کلثوم، سیالکوٹ۔ عبدالمقیت عزیز، لاہور۔ احد غفران، گوجرانوالہ۔ سبیکہ آصف، لاہور۔ حافظ عفیفہ اشرف، لاہور۔ ارحم فاطمہ، ملتان۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ زعیم احمد، لاہور۔ ناعمہ تحریم، کراچی۔ منتہا عزیز، لاہور۔ آمنہ فاروق، راول پنڈی۔ حافظ احمد محمود، راول پنڈی۔ طلحہ ظفر، وزیر آباد۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ وجیہہ زینب، اسلام آباد۔ اریبہ عظمت، حِبا عظمت، راول پنڈی۔ ضحیٰ شبیر، ملتان۔ محمد حسنات حمید، کاموکی۔ سیدہ آمنہ فاطمہ، کراچی۔ منیر احمد، کوٹ سلطان۔ حفصہ احسن قریشی، گوجر خان۔ فرحین شہزادی، گوجرانوالہ۔ حافظ محمد زکوان، بہاول پور۔ معوذ الحسن، ڈیرہ اسماعیل خان۔ محمد شاف حسین، اوکاڑہ۔ حفصہ ارشد، گوجرانوالہ۔ آمنہ اشرف، گوجرانوالہ۔ سماوی ناصر، ملتان۔ آمنہ طاہر، لاہور۔ افراح سجاد، راول پنڈی۔ رائقہ غیاث، ملتان۔ سید ضرار ازور بخاری، گوجرانوالہ۔ بلال احمد، اٹک۔ عدن سجاد، جھنگ۔ منیب الحسن، حافظ آباد۔ مطیع الرحمٰن، لاہور۔ صفی الرحمٰن، لاہور۔ عاصم عمر، واہ کینٹ۔ حافظ محمد منیب، وزیر آباد۔ حارث طاہر راٹھور، جلال پور جٹاں۔ محمد ذیشان، راول پنڈی۔ بلال حیدر، اوکاڑہ۔ احسن اکبر، لاہور۔ تحریم فاطمہ، لاہور۔ زوہیب احمد، لاہور۔ محمد حنان احمد، لاہور۔ وجیع ارمغان اصغر، سرائے عالم گیر۔ فرقان احمد، میانوالی۔ انیقہ فجر ظفر قریشی، میر پور۔ فاطمۃ الزہرہ، لاہور۔ عبداللہ شعیب، لاہور۔ محمد حسنات، راول پنڈی۔ زاکش خورشید، ایبٹ آباد۔ میرال فاطمہ، لاہور کینٹ۔

مشہور ادیب پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم کے صاحب زادے ڈاکٹر احسان رشید نے جو کراچی یونی ورسٹی کے وائس چانسلر بھی رہے، علی گڑھ میں قائداعظم کی تشریف آوری پر اپنی آٹوگراف بک ان کے سامنے رکھی اور اصرار کیا کہ اس پر کچھ لکھ دیں۔ قائداعظم بڑے پیار سے مسکرائے اور پھر آٹوگراف بک پر لکھا:

''ہمارے نبی اکرمؐ بچوں سے محبت کرتے تھے، بڑے ہو کر اس بات کو یاد رکھنا۔''

قائداعظم نے ایک مرتبہ کھیل کے انعامات کی تقریب میں شرکت فرمائی۔ ایک طالب علم جسے انعام ملا قائداعظم کے سامنے اس قدر گھبرا گیا کہ انعام لینے کے بعد آپ سے ہاتھ ملانا ہی بھول گیا۔ آپ نے بڑی نرمی اور شگفتگی سے اسے واپس بلایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ ''لڑکے تم بھاگے کیوں جا رہے ہو؟ مجھے یقین ہے یہ انعام تم نے جیتا ہے، کسی سے چھینا نہیں۔''

قائداعظم محمد علی جناح دہلی میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کرنے کے بعد پنڈال سے واپس جانے لگے تو ایک اجنبی شخص اچانک قائداعظم کے سامنے آ گیا۔ اس نے ملتجی نظروں سے قائداعظم کو دیکھا اور درخواست کی کہ میری بچی آپ سے مل کر آپ کو ایک تحفہ دینا چاہتی ہے۔ آپ ہمارے گھر تشریف لے چلیں۔ قائداعظم نے یہ دعوت قبول کر لی۔

قائداعظم سے ملاقات ہوئی تو بچی نے انہیں کپڑے کا ایک رومال پیش کیا جس پر بڑی محنت سے پاکستان کا نقشہ کڑھا ہوا تھا۔ یہ نقشہ قیامِ پاکستان سے قبل اس بچی نے خود ہی بنایا تھا۔ قائداعظم کو بچی کے جذبے نے بے حد متاثر کیا اور وہ اس واقعہ کو بھلا نہ سکے۔

کچھ عرصے کے بعد جب شملہ کانفرنس میں کانگریس نے لارڈ ڈیول کے ذریعے قائداعظم کو متحدہ ہندوستان کے گورنر جنرل کی پیشکش کرتے ہوئے یہ درخواست کی کہ وہ پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں تو قائداعظم نے اپنی جیب سے بچی کا دیا ہوا وہ رومال نکال کر لارڈ ڈیول کو دکھایا اور کہا۔ ''میں نے دس کروڑ مسلمانوں کے علاوہ اس بچی سے پاکستان دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

1940ء میں قائداعظم دہلی سے لاہور تشریف لے جا رہے تھے۔ غازی آباد کے ریلوے اسٹیشن پر گاڑی رُکی اور قائداعظم نیچے اُترے تو دیکھا کہ ایک دس برس کا بچہ پھولوں کا ہار لیے کھڑا ہے۔ دوسرے استقبالیوں کو چھوڑ کر قائداعظم خود اس کی طرف بڑھے اور کافی جھک کر اسے اپنے گلے میں ہار ڈالنے کا موقع دیا۔ پھر آپ اس سے پوچھنے لگے۔

''بیٹا تم یہاں کیوں آئے ہو؟''

بچے نے جواب دیا: ''آپ کو دیکھنے کے لیے۔'' قائداعظم نے کہا: ''تم مجھے کیوں دیکھنے آئے ہو؟''

بچہ بولا: ''قوم کے لیے۔''

قائداعظم بچے کا یہ جواب سن کر بہت خوش ہوئے اور حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ ''اب پاکستان ضرور بن کر رہے گا کیوں کہ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں میں بھی اپنی قوم کا احساس پیدا ہو گیا ہے۔'' قائداعظم کو نوجوانوں اور بچوں سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں اور ان پر انہیں بہت اعتماد تھا۔ حصولِ پاکستان کی جنگ لڑنے کے لیے قائداعظم نے نوجوانوں، خاص طور پر نوجوان طلبا ہی کو آگے بڑھایا۔ 1937ء میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن منظم کی۔ اس کا پہلا اجلاس قائداعظم کی صدارت میں 1937ء میں کلکتہ میں ہوا۔ اس میں انہوں نے بچوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ تحریکِ پاکستان کا ہراول دستہ ہیں۔ مجھے یقین ہے تم میں سے بہت سے جناح اُٹھیں گے، یقیناً مستقبل تمہارے ہاتھوں میں محفوظ ہے۔''

☆☆☆

یہ روضہ بھی وہاں ملے گا؟

مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے نام سے اہلِ علم حضرات خوب واقف ہیں۔ ایک دفعہ مولانا حج کے لیے تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وہاں دولت کی ریل پیل نہ تھی اور حجاز کی زمین نے ابھی تیل کے خزانے نہ اُگلے تھے۔ مولانا مدینہ منورہ گئے، وہاں ایک دن کھانے سے فارغ ہوئے تو دسترخوان کسی اونچی جگہ جھاڑا تا کہ روٹی کے بچے کھچے ٹکڑے چرند پرند کھا لیں۔ انہوں نے دیکھا کہ مدینہ منورہ کا ایک 8 سالہ معصوم بچہ وہ ٹکڑے کھا رہا ہے۔ مولانا اسے دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ بچے کو ساتھ لائے، کھانا کھلایا۔ پوچھا: تمہارے ابا کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگا: میں یتیم ہوں۔ مولانا نے کہا: بیٹا! تم میرے ساتھ ہندوستان چلو، میں تمہیں اچھے کھانے کھلاؤں گا۔ کپڑے پہناؤں گا، تمہیں تعلیم دلاؤں گا۔ جب بڑے عالم بن جاؤ گے تو میں تمہیں مدینے لے کر آؤں گا، تم جاؤ اور اپنی والدہ سے اجازت لے لو۔ بچہ گیا اور والدہ نے بھی اجازت دے دی۔ بچے نے معصومیت سے مولانا کی اُنگلی پکڑ کر پوچھنا شروع کیا، مجھے وہاں کھجوریں ملیں گی؟ بیٹا! یہ سب کچھ وہاں وافر مقدار میں ملے گا۔ اچانک اس نے مسجد نبویؐ کے دروازے اور روضے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ دروازہ اور یہ روضہ بھی ملے گا۔ مولانا نے درد بھرے لہجے میں کہا: بیٹے! وہاں یہ روضہ ہوتا تو پھر ہمیں یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس بچے کا رنگ بدلا اور کہنے لگا: یہ روضہ وہاں نہیں تو اسے چھوڑ کر آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا اور یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ مولانا ظفر احمد عثمانیؒ بھی بچے کا جواب سن کر اور اس کا یہ جذبہ دیکھ کر رو پڑے۔

کئی سو سال پہلے کی بات ہے کسی ملک پر بادشاہ فاران حکومت کرتا تھا۔ وہ ایک نیک، رحم دل اور عادل بادشاہ تھا۔ اس کے ملک میں غربت نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ عوام خوش اور مطمئن تھی۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا مگر یہ وقت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکا۔ کوئی چپکے سے بادشاہ کے خلاف منصوبے بنا رہا تھا۔ وہ سامری جادوگر تھا۔

سامری جادوگر سے بادشاہ کی پرانی چپقلش تھی۔ دس سال پہلے وہ بادشاہ کا درباری ہوتا تھا اور ملک کے اہم معاملات کے بارے میں بادشاہ کو مشورہ دیتا تھا مگر ساتھ ہی بادشاہ سے چھپ کر وہ کالا جادو کرتا تھا۔ دن بدن اس کی شکل بگڑ رہی تھی۔ کسی کے وجہ پوچھنے پر وہ ہمیشہ بات ٹال دیتا تھا مگر بادشاہ نہایت دانش مند واقع ہوا تھا۔ اسے سامری پر شک ہو گیا۔ محل میں سامری کی سرگرمیوں کے بارے میں ہونے والی چہ مگوئیاں بھی بادشاہ تک پہنچیں۔

بالآخر بادشاہ نے سامری سے دربار میں اس بارے میں استفسار کیا۔ سامری نے بات ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر جب اس کے گھر کی تلاشی لی گئی تو کالے جادو کے کئی ثبوت ملے۔

اپنا راز کھل جانے پر سامری گھبرا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ بادشاہ کالے جادو کے سخت خلاف ہے۔ اس نے بادشاہ سے بہت معافیاں مانگیں۔ اس نے رو رو کر گڑگڑاتے ہوئے کہا: ''بادشاہ سلامت! اس مرتبہ مجھے معاف کر دیں۔ آئندہ میں کالے جادو کے بارے میں سوچوں گا بھی نہیں۔''

بادشاہ انصاف پسند ہونے کے ساتھ ساتھ رحم دل بھی تھا، اس لیے اس نے سامری کو معاف کر دیا اور اعلان کیا: ''ہم سامری کو معاف کرتے ہیں لیکن اگر ہمیں معلوم ہوا کہ اس نے دوبارہ جادو کیا ہے تو ہم اسے سخت سزا دیں گے۔ البتہ سامری اس جرم کے بعد شاہی دربار کا حصہ نہیں رہ سکتا۔ ہم سامری کو محل سے نکل جانے کا حکم دیتے ہیں۔''

سامری سزا سے تو بچ گیا لیکن درباری کے رتبے سے ہٹائے جانے اور محل سے نکالے جانے پر اس نے بے حد توہین محسوس کی۔ وہ غرور کا پیکر تھا اور عام عوام کو کچھ نہ سمجھتا تھا مگر اب وہ بھی اسی عوام کا حصہ تھا۔

محل سے اپنے سامان کے ساتھ نکلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ سب لوگ اسے نفرت اور ناپسندیدگی سے دیکھ رہے ہیں، لیکن جب وہ درباری ہوتا تھا تو اسے عزت واحترام سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے ٹھان لی کہ بادشاہ سے اس ذلت و بدنامی کا انتقام ضرور لے گا۔

بادشاہ نے خفیہ طور پر چند سپاہیوں کو اس کی نگرانی پر لگایا تھا تاکہ اگر وہ دوبارہ کسی غلط سرگرمی میں ملوث ہو تو اسے فوراً پکڑا جائے مگر سامری بے حد مکار تھا۔ اسے اپنی جادوئی طاقتوں کے ذریعے ان سپاہیوں کے بارے میں علم ہوگیا۔ اس نے ان پر جادو کر دیا۔ جب وہ زمین پر پڑے تکلیف سے تڑپ رہے تھے تو سامری فرار ہوگیا۔

اپنے وعدے کے برعکس اس نے کالا جادو چھوڑنے کی بجائے اور زیادہ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے جنگلوں اور پہاڑوں کا سفر کیا اور کئی دوسرے جادوگروں کو اپنے ساتھ ملایا۔ اس نے کئی چلّے کاٹے اور شیطان کا چیلا بن گیا۔ شیطان نے بہت سی جادوئی اور شیطانی مخلوقات اس کے ہمراہ کیں۔ شیطان نے سامری کی طاقتیں مزید بڑھا دیں۔ وہ اب انسان نہ رہا تھا۔ اسے جان سے مارنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس پر کسی انسانی ہتھیار کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ سامری خود کو ایک ناقابلِ تسخیر جادوگر سمجھنے لگا۔ اس کی شکل وصورت بھی وقت کے ساتھ نہایت کریہہ ہوگئی۔

آہستہ آہستہ سامری نے ایک شیطانی فوج تیار کی۔ اس نے ملک میں فسادات پھیلانا شروع کیے۔ بادشاہ فاران کا ملک جو پہلے امن کا گہوارا ہوتا تھا، اب لڑائی جھگڑے اور بدامنی کا شکار ہو رہا تھا۔
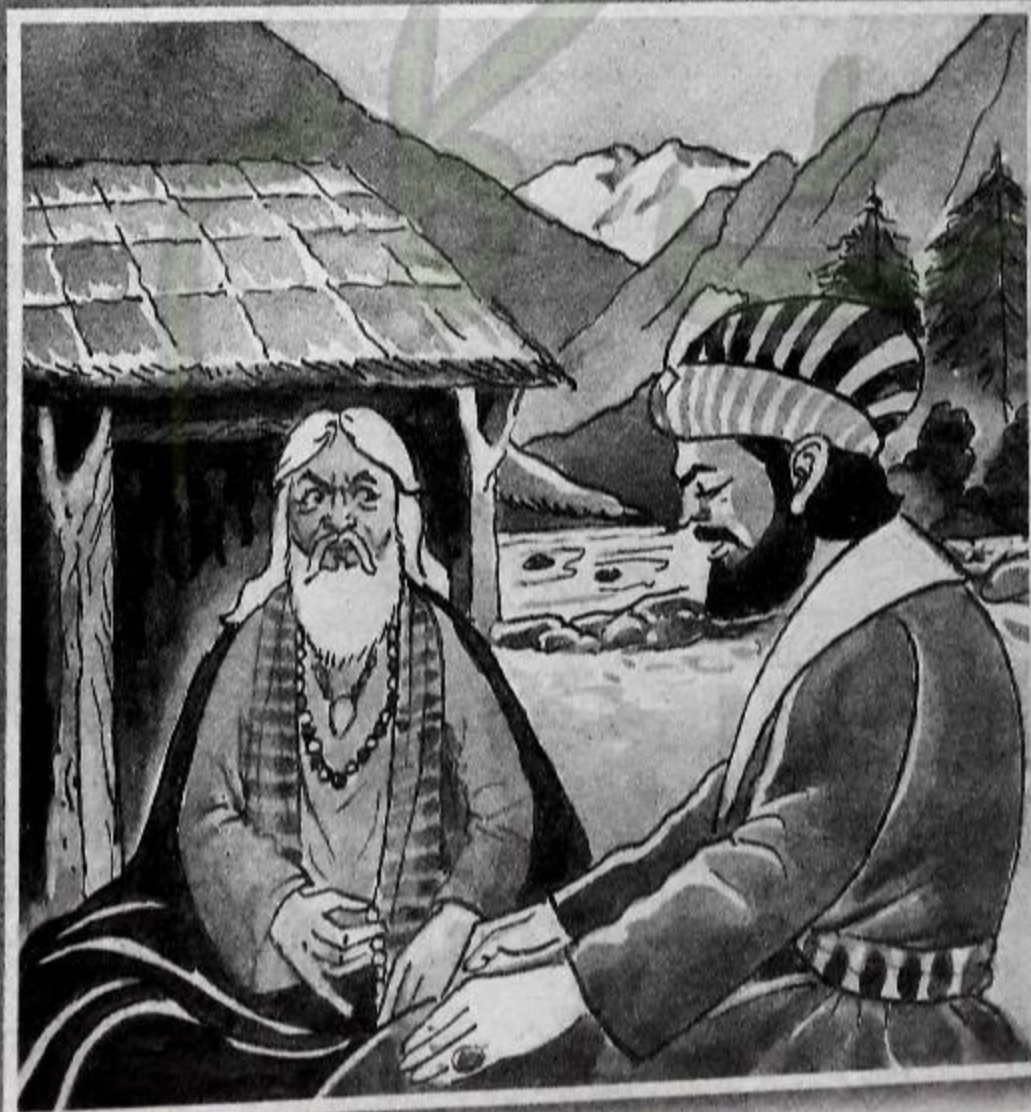
بادشاہ فاران پچھلے دس سالوں میں ملک کے بدلتے ہوئے حالات دیکھ رہا تھا۔ اس نے ملک کا امن برقرار رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر اب حالات اس کے قابو سے باہر ہو رہے تھے۔ بادشاہ کو یقین تھا کہ اس سب کے پیچھے سامری کا ہاتھ ہے۔ دس سال پہلے وہ اس کے سپاہیوں پر جادو کر کے بھاگا تھا اور اب تک نہ ملا تھا۔ بادشاہ نے اپنے مشیرِ خاص سے اپنے خدشات کا ذکر کیا۔ مشیر نے کہا: ”بادشاہ سلامت! نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ اگر اس سب کے پیچھے سامری جادوگر ہے تو یہ ایک نہایت گمبھیر معاملہ ہے۔ اس کے لیے آپ کو ایک بزرگ سے ملنا ہوگا جو شمالی پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ سنا ہے وہ بہت عبادت گزار اور پہنچے ہوئے بزرگ ہیں۔ شاید وہ کوئی حل بتا سکیں۔“

چناں چہ بادشاہ ایک چھوٹا سا وفد لے کر ان بزرگ سے ملنے گیا۔ وہ نہایت بوڑھے، نورانی چہرے والے سفید ریش بزرگ تھے جو شمالی پہاڑوں میں موجود ایک چھوٹی سی بستی میں قیام پذیر تھے۔ بادشاہ کی توقع کے برعکس وہ ساری دُنیا سے کٹ کر نہیں رہتے تھے بلکہ اپنی بستی کے تمام لوگوں سے میل جول بھی رکھتے تھے اور عبادت بھی کرتے تھے۔ ساری بستی کے لوگ ان سے دعائیں کرواتے تھے اور ان سے دینی مسائل پر گفتگو کرتے تھے۔

بادشاہ ان کے چھوٹے سے گھر میں ان سے نہایت ادب سے ملا۔ اس نے اپنا مدعا بیان کیا۔ بزرگ نے چند لمحے غور کیا اور پھر بولے: ”سامری جادوگر ایک شیطان صفت کالا جادوگر ہے۔ اس نے اپنی زندگی بڑھانے کے لیے طرح طرح کے چلّے کاٹے ہیں۔ اسے کسی چیز سے نہیں مارا جا سکتا۔“

یہ سن کر بادشاہ بہت پریشان اور مایوس ہوا۔ وہ بزرگ کا شکریہ ادا کر کے اپنی جگہ سے اٹھا اور پلٹ گیا۔

بادشاہ اور اس کا وفد جب محل میں واپس پہنچے تو جنگ کے آثار واضح نظر آ رہے تھے۔ عوام خوف زدہ تھی اور سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپے ہوئے تھے۔ بازار اور راستے سنسان تھے۔ اگلے چند گھنٹوں میں دیکھتے ہی دیکھتے محل کے سامنے سامری کی ہزاروں کی فوج جمع ہوگئی۔ سامری نے بلند آواز میں بادشاہ کو للکارا۔

''فاران! تو میری فوج کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اب تیری بادشاہی کا دور ختم ہوا۔ باہر آ اور اپنا تاج زمین پر رکھ دے۔''

بادشاہ ایک تیر کمان لیے باہر آیا۔ سامری نے اس کے ہتھیار کو دیکھ کر ایک بلند قہقہہ لگایا۔

''تجھے کیا لگتا ہے تو اس معمولی تلوار سے مجھے مار دے گا؟'' وہ بولا اور مسلسل قہقہے لگاتا رہا۔ اس کی ساری فوج بھی قہقہے لگا رہی تھی۔ بادشاہ نے تیر کمان میں ڈالا اور نشانہ لیا۔

سامری نے بادشاہ کو نشانہ لیتے ہوئے دیکھا تو اسے تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھا۔ چند قدم آگے بڑھ کر اس نے کہا: ''لے میں تیرے سامنے ہوں، وار کر!''

وہ اپنی شیطانی طاقت کے زعم میں بازو پھیلا کر کھڑا ہوگیا۔

بادشاہ نے اس کے دل کا نشانہ لے کر تیر چلایا۔ تیر سیدھا اس کے دل میں لگا۔ وہ گرنے کی بجائے اپنی جگہ پر کھڑا رہا جیسے تیر سے اس کے جسم پر کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔ اس نے ایک بار پھر فلک شگاف قہقہے لگانا شروع کر دیے، پھر وہ بولا۔

''فاران تیرا شوق پورا ہوگیا۔ تو نے مجھے تیر مار لیا مگر افسوس تو تیر چلا کر بھی ہار گیا اور میں تیر کا شکار ہو کر بھی جیت گیا۔''

بادشاہ نے سامری کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور کہا: ''کیا واقعی؟''

بادشاہ کے اعتماد پر سامری کی آنکھوں میں حیرت کی ایک رمق آئی۔ پھر اچانک اس کی مسکراہٹ سمٹ گئی۔ اس کے چہرے پر تکلیف اور خوف کے تاثرات نظر آنے لگے۔ پھر وہ بلند آواز میں چیخنے چلانے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا جسم راکھ کا ڈھیر بن کر زمین پر بکھر گیا۔

جب بادشاہ کو بزرگ نے بتایا تھا کہ سامری جادوگر کو کسی چیز سے نہیں مارا جا سکتا تو وہ مایوس ہو کر پلٹا مگر اسے پیچھے سے بزرگ کی آواز سنائی دی تھی۔ ''سوائے ایک ہتھیار کے..... بادشاہ سلامت! میرے پاس ایک تیر کمان ہے جس پر اسمِ اعظم پڑھا گیا ہے۔ اگر یہ تیر سامری کے دل میں مارا جائے تو وہ راکھ کا ڈھیر بن جائے گا۔''

یہ کہہ کر بزرگ نے بادشاہ فاران کو اپنے گھر کے اندرونی کمرے سے ایک تیر کمان لا کر دیا۔

اسی تیر کمان سے اب بادشاہ سامری جادوگر کی جان لے چکا تھا۔

سامری کے مرتے ہی اس کی شیطانی فوج خوف زدہ ہوگئی اور آن کی آن میں غائب ہوگئی۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگئی۔

لوگ اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور محل کے سامنے جمع ہوگئے۔ بادشاہ نے سامری کے جسم کی راکھ سے تیر اٹھایا اور اسے اونچا کرتے ہوئے بلند آواز میں بولا: ''لوگو! سامری کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ سامری اپنے غرور میں ہم سے انتقام لینے اور بادشاہت حاصل کرنے آیا تھا مگر وہ یہ بھول گیا تھا کہ خدا کا حکم شیطان کے ہر حربے پر بھاری ہوتا ہے۔ اگر کسی نے اس ملک میں دوبارہ انتشار پھیلایا تو اس کا یہی حشر ہوگا۔''

سامری کی موت پر لوگوں نے خوب جشن منایا۔ ملک میں امن لوٹ آیا۔ لوگ ایک بار پھر بادشاہ فاران کی حکومت میں ہنسی خوشی رہنے لگے۔

☆☆☆

زرافہ (Giraffe)

افریقہ کا جگالی کرنے والا سم دار پستانیہ (ممیل) صحرائے اعظم کے جنوبی حصے کے کھلے علاقوں میں رہتا ہے۔ اس کی امتیازی خصوصیت اس کی لمبی گردن ہے اور یہ سب سے قد آور حیوان ہے۔ زرافہ سم سے سر تک اٹھارہ فٹ لمبا ہوتا ہے۔ اس کی اگلی ٹانگیں پچھلی ٹانگوں سے بہت زیادہ لمبی ہوتی ہیں۔ دوڑنے میں زیادہ تر دشمنوں کو مات دے دیتا ہے۔ یہ جانور چھوٹے چھوٹے گلوں میں رہتا ہے۔ ایک گلے میں ایک نر اور متعدد مادائیں اور ان کے بچے ہوتے ہیں۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سینگوں پر کھال بھی ہوتی ہے جس پر بال ہوتے ہیں۔ رنگ ہرن کی طرح ہلکا مٹیالا لیکن بدن پر سیاہ داغ ہوتے ہیں۔ زبان بھی غیر معمولی لمبی ہوتی ہے۔ یہ خاص طور پر کیکر اور لاجونتی کی قسم کے پتے کھاتا ہے جنہیں وہ اپنی لمبی زبان اور متحرک ہونٹوں کے ذریعے منہ میں لیتا ہے۔ یہ پانی کے بغیر بہت عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے۔ مادہ ایک وقت میں ایک بچہ دیتی ہے جس کا قد 6 فٹ کے قریب ہوتا ہے۔ زرافہ کی اوسط عمر تقریباً 28 سال ہوتی ہے۔

میری زندگی کے مقاصد
مزمل آصف، کراچی
میں فوجی بن کر ملک کی حفاظت کروں گا۔
عائشہ الفت، لاہور
میں پڑھ لکھ کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔
محمد مامون، فیصل آباد
میں سی ایس ایس کر کے ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
سید اریب احمد، کراچی
میں عالم دین بن کر اسوۂ حسنہ کی پیروی کروں گا۔
محمد علی حیدر، لاہور
میں آرمی آفیسر بن کر اپنے وطن کی حفاظت کروں گا۔
عائشہ صدیقہ، جہلم
میں ڈاکٹر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گی۔
زینب محبوب، جہلم
میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کروں گی۔
کلثوم آصف، لاہور
میری زندگی کا مقصد تیرے دین کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلمان، میں اسی لیے نمازی
عبدالباسط، لاہور
میں انجینئر بن کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
عبداللہ فاروق، راولپنڈی
میری زندگی کا مقصد دوسروں کے کام آنا ہوگا۔
حسیب خالد، کراچی
میں سائنس دان بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔
مقدس چوہدری، راولپنڈی
میں بڑی ہو کر ڈاکٹر بنوں گی اور غریبوں کا مفت علاج کروں گی۔
عبادالرحمٰن، کراچی
میں حافظ قرآن بن کر دینِ اسلام میں شمع روشن کروں گا۔
اقراء سعید، لاہور
میں پائلٹ بن کر ملک کی سرحدوں کی حفاظت کروں گی۔
احسن اعجاز، کراچی
میں حافظِ قرآن بننا چاہتا ہوں۔
صائم نور، اسلام آباد
میں بڑا ہو کر ڈاکٹر بنوں گا اور ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔
عبدالہادی، راولپنڈی
میں بڑا ہو کر پائلٹ بنوں گا اور پاکستان کی حفاظت کروں گا۔
محمد احمد، ڈیرہ اسماعیل خان
میں ایک اچھا انسان بن کر ملک و قوم کا نام روشن کروں گا۔
ماجد اقبال، کراچی
میں بڑا ہو کر دینِ اسلام کی تعلیمات پوری دنیا میں عام کروں گا۔
25
دسمبر 2014

مختصر مختصر

ہمارے قائد

کتنے ہیں پیارے قائد — میرے قائد، تمہارے قائد
دشمن بھی لرز اُٹھے — ایسے ہیں ہمارے قائد
چھوٹے بڑے بوڑھے بچے — سب کی آنکھوں کے تارے قائد
کمزوروں کی ہیں طاقت — غریبوں کے سہارے قائد
باطل سے شکست نہ مانی — دشمنوں سے نہ ہارے قائد
کوئی ان سے جیت نہ پایا — ایسا کرشمہ ابھارے قائد
بہرآم کتنے اوصاف بیاں کروں — خوبیوں کے ہیں دھارے قائد

(شاہ بہرام انصاری، ملتان)

عہدِ وقت

تمہیں آگے بڑھنا ہے — تمہیں آگے چلنا ہے
ماضی کو دیکھ کر — حال میں ڈھلنا ہے
گزری غلطیوں کو جان کر — سب سے بچنا ہے
اس وقت کے چکر سے — دو قدم آگے بڑھنا ہے
ڈال کر ستاروں پر کمند — عالم کو حیران کرنا ہے
خدا کو یاد رکھنا ہے — اسد خود کو روشن کرنا ہے

(اسد علی اسد، ملتان)

ماں

میری ماں پیاری ماں — تیرے جیسا کوئی ناں
میری خاطر یوں بستر بنایا — گھر سارا پھولوں سے سجایا
اس کے اوپر مجھے سلایا — اللہ ہو کا ورد سنایا
میری ماں ہے اک فرشتہ — اس سے میرا پیار کا رشتہ
تاقیامت ٹوٹ نہ پائے — اللہ بھی نام لے ماں کا بلائے
کتنا پیارا نام ہے ماں — میری ماں، پیاری ماں

(مریم نایاب، نوشہرہ)

پیغام

ذکرِ پروردگار کرتے چلو — اپنے دل کو بہار کرتے چلو
دل کی تسکین بس اسی میں ہے — یہ عمل بار بار کرتے چلو
رب کا محبوب تم کو بننا ہے — اس کے بندوں سے پیار کرتے چلو
جان دی ہے خدا نے تم کو — جان اس پر نثار کرتے چلو
پھول اگاؤ جہاں پر کانٹے ہیں — ہر خزاں کو بہار کرتے چلو
خوش نصیبو! یونہی رہو خوش تم — بدنصیبوں سے پیار کرتے چلو

لمحہ فکریہ

☆ جب مسلمان دُعا مانگنا کم کریں گے تو مصائب نازل ہوں گے۔
☆ جب صدقات دُنیا بند کریں گے تو بیماریاں بڑھیں گی۔
☆ جب زکوٰۃ دینا بند کریں گے، تو مویشی ہلاک ہوں گے۔
☆ جب ریاکاری بڑھ جائے گی تو زلزلے بکثرت آئیں گے۔
☆ جب حکم خدا کے خلاف فیصلے کریں گے تو ان پر ان کے دشمن غالب ہوں گے۔
☆ جب عہد شکنی کریں گے تو اللہ انہیں قتل کے ذریعے آزمائے گا۔
☆ جب ناپ تول کم کریں گے تو ان پر قحط مسلط کیا جائے گا۔
☆ جب نماز قضاء کریں گے تو ان پر کافروں جیسا سلوک کیا جائے گا۔

(میرا اکبر غوری، بھکر)

سوچو تو سہی

جون کا مہینہ تھا۔ سورج آگ برسا رہا تھا۔ ابو نے مجھے بازار سے برف لانے کو کہا۔ جب میں برف لے کر واپس گھر آ رہا تو میلے کچیلے کپڑوں اور گرد آلود بالوں والے دو لڑکے میری طرف لپکے۔ وہ سڑک کنارے لگے ہوئے ایک درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکا میری سائیکل کے قریب آ کر برف مانگنے لگا۔ اس کے لہجے میں التجا اور درد تھا۔ مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہوئی اور میں نے تھوڑی سی برف توڑ کر ان کے برتن میں ڈال دی۔ اس برتن میں پہلے سے کچھ پانی موجود تھا۔ ان دونوں نے اپنے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے سے خشک باسی روٹی نکالی اور خوشی سے چلائے: ’’آہا! ٹھنڈے پانی سے روٹی کھائیں گے۔‘‘ پھر وہ اسی روٹی کو پانی کی مدد سے نرم کر کے حلق سے اُتارنے لگے۔

ایک ہم لوگ ہیں کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتے ہیں۔ بے جا فرمائشوں سے والدین کا ناک میں دم کرتے ہیں اور ایک وہ

ہیں، کتنی چھوٹی خوشیاں ہیں ان کی اور اس پر بھی راضی ہیں۔

(عائشہ سعید، راہوالی)

چار دوست

کسی شہر میں چار دوست رہتے تھے۔ ایک دوسرے کے کام آنے والے نہایت مخلص اور محنتی۔ جب ان میں سے ایک دوست مرنے لگا تو اس نے باقی دوستوں سے پوچھا کہ اس وقت میرے کون کام آئے گا؟ پہلے دوست نے کہا: ”میں دُنیا میں کام آ سکتا ہوں۔“ دوسرے نے کہا: ”میں تمہارے مرنے کے بعد کفن دفن کا انتظام کروں گا۔“ تیسرے دوست نے کہا: ”میں تمہارے ساتھ قبر میں اُتروں گا۔ جب فرشتے قبر میں تمہیں حساب کے لیے اُٹھائیں گے، تب میں تمہارے ساتھ رہوں گا۔“ کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ دوست کون تھے؟ یہ تھے: مال، عیال اور اعمال۔ (علی حمزہ بھٹہ، راول پنڈی)

روزے کی فضیلت

ایک بار موسیٰ علیہ السلام نے اللہ پاک سے عرض کیا:

”یا اللہ پاک تو نے مجھے ہم کلام ہونے کا شرف بخشا ہے، کیا کسی اور کو بھی یہ شرف حاصل ہوگا؟“

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اے موسیٰ! میں سب سے آخر میں ایک اُمت بھیجوں گا جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت ہوگی۔ وہ لوگ جب روزہ رکھیں گے تو ان کے ہونٹ اور زبان پیاس سے خشک ہوں گی، کمزور جسم اور ترسی ہوئی آنکھیں ہوں گی، پیٹ خالی ہوگا، وہ بھوک پیاس برداشت کریں گے۔ جب افطار کے وقت وہ دعا مانگیں گے تو وہ تمہاری نسبت میرے زیادہ قریب ہوں گے۔

(دُعا اعظم، شیخوپورہ)

شہید کو چھ انعامات ملتے ہیں

مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ شہید کو چھ انعامات حاصل ہوتے ہیں۔

1۔ اس کے خون کا پہلا قطرہ زمین پر گرتے ہی اس کے کل گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔
2۔ اسے اس کا جنت میں مکان دکھلا دیا جاتا ہے۔
3۔ نہایت خوب صورت بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے اس کا نکاح کرا دیا جاتا ہے۔
4۔ وہ بڑی گھبراہٹ میں بھی امن میں رہتا ہے۔
5۔ وہ عذاب قبر سے بچا لیا جاتا ہے۔
6۔ اسے ایمان کے زیور سے آراستہ کر دیا جاتا ہے۔

(عریشہ بنتِ حبیب الرحمٰن، کراچی)

اقوالِ حضرت علیؓ

☆ انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔
☆ سب سے بہترین لقمہ وہ ہے جو اپنی محنت سے حاصل کیا جائے۔
☆ ہمیشہ سچ بولو تاکہ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہ پڑے۔
☆ موت کو ہمیشہ یاد رکھو مگر موت کی آرزو نہ کرو۔
☆ ادب بہترین کمال ہے اور خیرات افضل ترین عبادت ہے۔

(عدن سجاد، جھنگ صدر)

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں

☆ عقل مندوں کو نصیحت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے، اصلاح کی ضرورت تو بے وقوفوں کو ہے۔ (بل کوبی)
☆ پیشگی منصوبہ بندی مشکل ہوتی ہے مگر اس پر عمل آسان ہوتا ہے۔ (رابرٹ ایم پرسگ)
☆ باقاعدگی، تربیت اور محنت کی عادتوں اور ایک وقت میں ایک موضوع پر اپنی توجہ کے ارتکاز کے عزم کے بغیر میں کبھی بھی نہ کر پاتا۔ (چارلس ڈکنز)
☆ بہت سے لوگ سوچنے پر مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں اور ایسا ہی کر گزرتے ہیں۔ (برٹرینڈ رسل)
☆ دو طرح کے لوگوں سے آپ بحث نہیں کر سکتے، اوّل ڈھیٹ اور دوم احمق۔ (وکٹر آر سمتھ)
☆ بہت سے نقصانات انسان کو اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ وہ کسی سے مشورہ نہیں لیتا۔ (افلاطون)

(زینب ناصر، فیصل آباد)

قائداعظمؒ نے فرمایا

”میں نے بہت دُنیا دیکھ لی۔ اللہ تعالیٰ نے عزت، دولت، شہرت بھی بے حساب دی۔ اب میری زندگی کی ایک ہی تمنا ہے کہ مسلمانوں کو باوقار اور سربلند دیکھوں۔ میری خواہش ہے کہ جب مروں تو میرا دل گواہی دے کہ جناح نے اللہ کے دین اسلام سے خیانت اور پیغمبرِ اسلام حضرت محمد ﷺ کی امت سے غداری نہیں کی۔ مسلمانوں کو آزادی، تنظیم، اتحاد اور مدافعت میں اپنا کردار ٹھیک ادا کیا اور میرا اللہ کہے کہ اے میرے بندے! بے شک تو مسلمان پیدا ہوا۔ بے شک تو مسلمان مرا.....!“

(قائداعظم محمد علی جناحؒ کا 30 جولائی 1948ء کو لاہور میں اسکاؤٹ ریلی سے خطاب)

رَسّی جل گئی پر بَل نہیں جلا

زبیدہ سلطانہ

ریشم کھاتے پیتے گھر کی بیٹی تھی۔ اکلوتی ہونے کی وجہ سے بہت لاڈ پیار میں پلی تھی۔ ماں باپ کے بے جا لاڈ نے اسے بہت بگاڑ دیا۔ ماں اسے گھر کے کام کاج کو ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ ہر وقت وہ سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود اور گپ شپ میں لگی رہتی۔ جوان ہوئی تو آرام طلبی اور خود پسندی اس کی فطرت میں رَچ بس چکی تھی۔

جب ریشم کی شادی ہوئی تو اس کا شوہر قادر بھی اچھا خاصا پیسے والا تھا۔ پہلے پہل اسے شوہر کے گھر میں آرام اور آسائشیں حاصل رہیں، مگر چند سال بعد کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ قادر کی مالی حالت اچھی نہ رہی۔ گھر کے کام کاج کے لیے نوکر چاکر رکھنے کی گنجائش نہ رہی تو ریشم کو سب کام خود کرنا پڑا، جس کی اُسے عادت نہ تھی۔ وہ بہت تکلیف محسوس کرتی اور ہر وقت شوہر پر خفا ہوتی۔ کام کرتے ہوئے بڑبڑاتی، کبھی ہاتھوں کے چھالے دکھاتی، کبھی سبزی بناتے انگلی کاٹ لیتی۔ سر پر تو درد کے مارے ہر وقت پٹی باندھے رکھتی۔ امیرانہ نازک مزاجی اس سے چھٹ نہ سکی تھی۔

ایک دن قادر اپنے حقے کی چلم کے لیے بان کی رسّی جلا رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی چارپائی کے بان کی رسّیاں لپیٹ کر اس نے رکھی ہوئی تھیں۔ جب چولہے میں آگ نہ ہوتی تو وہ رسّیاں لپیٹ کر جلا لیتا اور چلم میں رکھ لیتا۔ وہ اپنے کام میں لگا تھا کہ ریشم بولی: ’’تمہیں کتنی بار کہا ہے کہ میرا منہ دھونے کا صابن ختم ہو چکا ہے، پسینے کی الگ بو آتی ہے، پرفیوم نہیں تو پاؤڈر ہی لا دو......‘‘

اس کی فرمائشیں جاری تھیں کہ قادر کے ہنسنے کی آواز پر وہ چونک کر بولی: ’’تمہیں ہنسی کس بات پر آئی؟‘‘

قادر کہنے لگا: ’’یہاں آؤ تمہیں کچھ دکھاؤں۔‘‘ وہ قریب گئی تو قادر نے جلی ہوئی رسّی کی طرف اشارہ کر کے کہا: ’’یہ دیکھتی ہو، اس رسّی کی طرف دیکھو۔ یہ جل گئی ہے پر اس کے بل نہیں جلے!‘‘

ریشم حیران ہو کر بولی: ’’تو مجھے کیوں دکھاتے ہو، میں کیا کروں؟‘‘

’’تمہیں اس لیے دکھاتا ہوں کہ تمہاری حالت بھی اس رسّی کی طرح ہے کہ اس حال میں بھی تمہاری وہ امیرانہ عادتیں نہیں چھٹیں، تمہاری بدمزاجی اور غرور نہیں ٹوٹا، نمائش اور دکھاوے کی عادت نہیں چھوٹی جیسے یہ رسّی جل گئی پر بل نہیں جلے۔‘‘

گل نرگس

گل نرگس (Daffodil) کو دسمبر کا پھول کہا جاتا ہے۔ اس کا سائنسی نام Narcissus ہے جس کا تعلق Amaryllidaleae خاندان سے ہے۔ یہ سدا بہار پودا ہے جو بلب نما تنے سے نکلتا

ہے۔ پودا 5 سینٹی میٹر سے 80 سینٹی میٹر اونچا ہوتا ہے۔ تنے پر کوئی پتا نہیں ہوتا۔ تنا سبز رنگ کا ہوتا ہے۔ پھول کے Sepals اور Petals میں فرق نہیں ہوتا، اسی لیے پھولوں کی پتیوں کو Tepals کہا جاتا ہے۔ پھول دلفریب اور ہلکی خوش بو رکھتے ہیں جو سفید، ہلکے پیلے یا گہرے پیلے رنگ کے ہوتے ہیں۔ پھولوں کا قطر 12 سے 125 ملی میٹر ہوتا ہے۔ پتے لمبوترے اور تعداد میں 2 سے 4 تک ہوتے ہیں۔ اس پودے سے 100 کیمیائی مادے (Alkaloids) حاصل ہوتے ہیں۔ تھیوفراستوس (Theophrastus) نے لگ بھگ 250 قبل مسیح اپنی کتاب میں اس پھول کا ذکر کیا۔ اس کی تقریباً 52 انواع (Species) دریافت ہو چکی ہیں۔ دُنیا بھر کے شاعروں اور ادیبوں نے نرگس کے پھول کے حسن کو قلم بند کیا ہے۔ ان میں ولیم ورڈز ورتھ کی نظم "The Daffodils" نے عالم گیر شہرت پائی۔ گل نرگس ادویات اور پرفیومز کی تیاری میں استعمال ہوتا ہے۔ امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا، آئرلینڈ وغیرہ میں کینسر کے مریضوں کے لیے فنڈ ریزنگ تنظیمیں گل نرگس کو بطور علامت استعمال کرتے ہیں۔

برفانی چیتا

برفانی چیتا (Snow Leopard) کو عموماً دسمبر کا جانور (Animal of December) کہا جاتا ہے۔ اس کا سائنسی

نام Panthera Uncia ہے جب کہ اس کا تعلق Felidae خاندان سے ہے۔ ان کا وزن 27 سے 55 کلوگرام (60 سے 121 پونڈ) ہوتا ہے۔ نر برفانی چیتا 75 کلوگرام اور چھوٹی سے چھوٹی مادہ کا وزن 25 کلوگرام تک ہوتا ہے۔ دم لمبی ہوتی ہے جو 80 سے 100 سینٹی میٹر (31 سے 39 انچ) ہو سکتی ہے۔ سائی

بیریا، روس، قازقستان، کرغزستان اور افغانستان کے جنگلوں میں رہنے والے برفانی چیتے ازبکستان، تاجکستان، پاکستان، بھارت، نیپال، بھوٹان اور منگولیا وغیرہ میں بھی پائے جاتے ہیں۔ کشمیر میں بھی برفانی چیتے پائے جاتے ہیں۔ برفانی چیتے چٹانوں پر پیشاب کر کے دوسرے چیتے کو خبردار کرتے ہیں کہ یہ اس کا علاقہ ہے۔ چیر پھاڑ کر دوسرے جانوروں سے خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ان کے بچوں کو Cubs کہتے ہیں۔ برفانی چیتا پاکستان کا قومی ورثہ جانور ہے۔ دُنیا کے کئی ممالک میں مختلف تنظیمیں بطور علامت ''برفانی چیتا'' کا نشان استعمال کرتی ہیں۔

فیثا غورث

فیثا غورث (Pythagoras) 570 قبل مسیح میں پیدا ہوئے اور 495 قبل مسیح میں وفات پائی۔ آپ ایک یونانی فلسفی، مذہبی رہنما

اور عظیم ریاضی دان تھے۔ آپ کے والد ایک تاجر تھے جن کا نام Mnesarchus تھا۔ آپ کی پیدائش Samos میں ہوئی جو یونان کا جزیرہ ہے۔ غورث کی وجہ شہرت ریاضی میں ایک مشہور زمانہ تصور (Pythagorean Theorem) کی وجہ سے ہے جو جیومیٹری کا حصہ ہے۔ تاہم فیثا غورث نے موسیقی پر بھی تحقیق کی اور معلوم کیا کہ آواز پیدا کرنے والے آلے کی جسامت بدلنے سے آواز بدل جاتی ہے۔ فیثا غورث نے لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے اسکول بھی کھولا جہاں مذہب اور سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فیثا غورث نے پہلی مرتبہ وضاحت کی کہ زمین گول ہے جس کے کنارے باہر کو نکلے ہیں (بیضوی شکل) اور زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

ویٹی کن سٹی

ہر سال دُنیا بھر میں عیسائی حضرت عیسیٰؑ کا دن 25 دسمبر کو بحیثیت کرسمس مناتے ہیں۔ اس روز گرجا گھروں (Church)

میں خصوصی عبادت ہوتی ہیں۔ سب سے بڑا اجتماع روم شہر کے ویٹی کن سٹی (Vatican City) میں ہوتا ہے۔ یہ علاقہ 44 ہیکٹرز یا 110 ایکڑ پر مشتمل ہے۔ یہاں کے عیسائی مذہبی رہنما کو پوپ (Pop) کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں کے فرقے کیتھولک کا یہاں بڑا اجتماع ہوتا ہے جہاں عبادت کی جاتی ہے۔ ویٹی کن سٹی کو علیحدہ ریاست کا درجہ حاصل ہے جو 1929ء کو قائم ہوئی۔ یہاں کی سرکاری زبان اطالوی اور لاطینی بھی سمجھی جاتی ہے۔ پوپ اس "Walled City" کے سربراہ اور اٹلی کی فورسز اس کی سیکیورٹی سنبھالتی ہیں۔ کرسمس کے روز پوپ عوام کو اپنا دیدار کرواتے ہیں اور بائبل کی آیات تلاوت کرتے ہیں۔

☆☆☆

درج ذیل دیے گئے جوابات میں سے درست جواب کا انتخاب کریں۔

1۔ سلطان السلاطین کس بزرگ کا لقب ہے؟

i۔ بہاؤ الدین زکریاؒ ii۔ نظام الدین اولیاءؒ iii۔ معین الدین چشتیؒ

2۔ بناسپتی گھی بنانے میں کون سی گیس استعمال ہوتی ہے؟

i۔ نائٹروجن ii۔ ہائیڈروجن iii۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ

3۔ مینارِ پاکستان لاہور کا نقشہ کس نے تیار کیا؟

i۔ نیئر علی دادا ii۔ مرات خان iii۔ گل جی

4۔ قرآن پاک میں یوم بدر کو کس نام سے منسوب کیا گیا ہے؟

i۔ یومِ الفرقان ii۔ یومِ الفیل iii۔ یومِ الحزن

5۔ علمِ ہیئت کس علم کو کہتے ہیں؟

i۔ علمِ تحقیق ii۔ علمِ فلکیات iii۔ علمِ غیب

6۔ اقبال کا شعر مکمل کیجیے۔

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے ....

7۔ بلوچی زبان میں ساربانوں اور چرواہوں کے گیت کو کیا کہتے ہیں؟

i۔ سوت ii۔ لیکو iii۔ موتک

8۔ مَسح کا کیا مطلب ہے؟

i۔ پونچھنا یا ہاتھ پھیرنا ii۔ مٹانا iii۔ خشک کرنا

9۔ کس شخصیت کے دستخط پاکستان کی ڈاک ٹکٹوں پر چھاپے گئے تھے؟

i۔ علامہ اقبالؒ ii۔ قائدِاعظمؒ iii۔ لیاقت علی خانؒ

10۔ درہ گومل پہ کون سا شہر آباد ہے؟

i۔ ڈیرہ اسماعیل خان ii۔ مظفر گڑھ iii۔ شجاع آباد

جوابات علمی آزمائش نومبر 2014ء

1۔ حج 2۔ مسجدِ اقصیٰ 3۔ سوڈیم ٹرائی سیلیکیٹ 4۔ پانامہ 5۔ چھ مصرعے
6۔ سات کھلاڑی 7۔ ساقی نامہ 8۔ طلاب 9۔ امیرِ خسرو 10۔ مسجدِ نمرہ

اس ماہ بے شمار ساتھیوں کے درست حل موصول ہوئے۔ ان میں سے 3 ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعامات دیے جا رہے ہیں۔

☆ محمد حسنات حمید، کامونکی (150 روپے کی کتب)

☆ انشراح سلیم، لاہور (100 روپے کی کتب)

☆ حذیفہ اویس، فیصل آباد (90 روپے کی کتب)

دماغ لڑاؤ سلسلے میں حصہ لینے والے کچھ بچوں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی:
مشعال آصف، لاہور۔ عدن سجاد، جھنگ۔ اسلام الدین، کراچی۔ عقیلہ رباب منہاس، تلہ گنگ۔ تحریم فاطمہ، لاہور۔ محمد حذیفہ بن احسن، گوجر خان۔ انیقہ فجر، میرپور، آزاد کشمیر۔ عائشہ تبسم، لاہور۔ طٰہٰ یاسین، حیدر آباد۔ وجیہہ زینب، اسلام آباد۔ آصف علی، لاہور۔ سید عبدالرحمٰن، راول پنڈی۔ اریبہ عظمت، حبا عظمت، راول پنڈی۔ مہر اکرم، لاہور۔ رومیسہ زینب چوہان، راول پنڈی۔ نمرہ ناز، راول پنڈی۔ حافظ محمد منیب، وزیر آباد۔ محمد صادق شیخ، حیدر آباد۔ محسن علی، حسن ابدال۔ حفصہ اعجاز، صوابی۔ رائقہ غیاث، ملتان۔ عروہ جاوید وڑائچ، بہاول نگر۔ زویا احمد، گوجرانوالہ۔ اسد الرحمٰن، لاہور۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ احد غفران، گوجرانوالہ۔ سبیکہ آصف، لاہور۔ محمد حسنات، راول پنڈی۔ سید طلحہ علی خالد، جھنگ صدر۔ عاصم عمر، واہ کینٹ۔ عشاء نور، سیال کوٹ۔ ثمرہ طارق بٹ، گوجرانوالہ۔ بلال احمد، حسن ابدال۔ ہاجرہ ابراہیم ورک، راول پنڈی۔ منیر احمد، ریاض احمد، کوٹ سلطان۔ فہد امین، گوجرانوالہ۔ عبدالمقیت عزیز، لاہور۔ محمد عبداللہ ثاقب میر، پشاور۔ افراح سجاد، راول پنڈی۔ شہزادی خدیجہ شفیق، لاہور۔ عبداللہ ظفر، وزیر آباد۔ فاطمہ ہاشم، لاہور۔ احمد یار، لاہور۔ عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ، لاہور۔ فرقان عابد، میانوالی۔ سید نقیب الفضل ہاشمی، راول پنڈی۔ حافظ محمد طیب اعوان، لاہور۔ محمد ذیشان، راول پنڈی۔ سمیعہ توقیر، ملیر، کراچی۔ طوبیٰ راشد، لاہور۔ میرال فاطمہ، لاہور کینٹ۔ مطیع الرحمان، صفی الرحمان، لاہور۔

کھوج لگایئے!

ذہانت آزمائیں اور 500 روپے کی کتابوں کا انعام پائیں۔

ہر جمعرات کو ہمارے اسکول میں بزمِ ادب کا اہتمام ہوتا ہے۔ ہمارے اساتذہ کرام ہماری صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے تقریری مقابلے، نعت خوانی کے مقابلے، بیت بازی، خوش خطی کے مقابلوں کا بہت دل چسپی سے اہتمام کرتے ہیں۔ ہماری ذہنی مشق کے لیے کوئز پروگرامز بھی ہوتے ہیں۔ آخر میں جب وقت بچ جائے تو ہمارے اساتذہ بڑی بے تکلفی سے گفتگو بھی کرتے ہیں۔ آج بھی انہوں نے ہماری دل چسپی کے لیے تختہ سیاہ پر کچھ جملے لکھے اور ہمیں کہا کہ ان جملوں میں کچھ سبزیوں اور پھلوں کے نام چھپے ہیں۔

پیارے بچو! آپ بھی انھیں ڈھونڈ کر ہمیں لکھ بھیجیے۔ آپ کی آسانی کے لیے جس جگہ یہ الفاظ پائے جاتے ہیں ان کے نیچے لائن لگائی گئی ہے۔

i۔ کمال تانگہ چلاتا ہے۔

ii۔ کل تو ہمارا لُو کے مارے بُرا حال تھا۔

iii۔ وہ کل لاہور سے بنوں روانہ ہوگیا۔

iv۔ اسلم جرابیں گن رہا ہے۔

v۔ عذرا تو ریحانہ کے گھر گئی ہے۔

vi۔ آپا لکڑی کا صندوق پسند کرتی ہے۔

vii۔ گو بھیا شریر ہیں مگر دل کے بُرے نہیں۔

viii۔ رحیم ٹرام کا ڈرائیور ہے۔

نومبر 2014ء میں شائع ہونے والے "کھوج لگایئے" کا صحیح جواب یہ ہے:

نعیم کی بائیں مٹھی میں مٹر کے 12 دانے ہیں۔

نومبر 2014ء کے کھوج لگایئے میں قرعہ اندازی کے ذریعے درج ذیل بچے انعام کے حق دار قرار پائے ہیں:

1- سید عبدالرحمٰن، راولپنڈی
2- وردہ زہرہ، جھنگ صدر
3- مقبول احمد ٹیکسلا کینٹ
4- رابعہ جاوید، لاہور
5- ریان وارث، سیال کوٹ

کبوتر

رانا محمد شاہد

کبوتر کا شمار دُنیا کے خوب صورت ترین پرندوں میں ہوتا ہے۔ یہ انسان کا پُرانا ساتھی ہے اور آج بھی بڑے ذوق و شوق سے پالا جاتا ہے۔ کبوتر دُنیا کے تقریباً ہر ملک اور خطے میں پایا جاتا ہے۔ اس پرندے کی بھولی بھالی صورت، خوب صورت گردن، ریلی آنکھیں اور بانکی چال اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ کبوتر کی آنکھ کا ڈیزائن ایک آتشی شیشہ یا دُوربین کی طرح کا ہوتا ہے، درمیان سے موٹا اور سائیڈ سے قدرے باریک۔ اسی طرح ایک اچھے کبوتر کی آنکھ ایک بلب کی مانند اُبھری ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں کبوتر کا مرکزی تل یا آنکھ کا کالا نور ایک کیمرے کے آٹو فوکس لینز کا کام بھی کرتا ہے جو دُور و نزدیک یا روشنی و اندھیرے میں پھیلتا اور سکڑتا ہے۔ آنکھ کی تپلی جتنی زیادہ باریک ہوگی، اتنی ہی زیادہ گرمی برداشت کرے گا اور سورج کی روشنی میں اُڑے گا۔ جن کبوتروں کی کالی پُتلی کے گرد سرمئی دائرہ یا رنگ ہوگا، وہ بے حد ذہین ہوگا۔ گرمی، بارش، طوفان ہر صورت میں واپس آئے گا۔ کبوتر کی آنکھ اس کی نسل اور اس میں موجود خصوصیات کا پتا دیتی ہے۔ اچھے کبوتر کی آنکھیں چمک دار اور شفاف ہوں گی۔ کبوتر کی چمکیلی آنکھ بہت اچھی ہے، خشک آنکھ کا کبوتر اچھا نہیں ہوتا۔

کبوتر کی سب سے بڑی اور اہم دو اقسام ہیں، جنگلی کبوتر اور پالتو کبوتر۔ پالتو کبوتر وہ ہیں جو ہم گھروں میں پالتے ہیں جب کہ جنگلی کبوتر جنگلوں، میدانوں اور شہر کی سڑکوں پر پائے جاتے ہیں۔ پالتو بھی دراصل جنگلی کبوتروں کی ہی نسل ہے۔ 3100 سال قبل مسیح میں مصر کے لوگ چٹانی جنگلی کبوتروں کو ہی پالتو کبوتر کے طور پر پالتے تھے۔ چٹانوں پر رہنے والے یہ جنگلی کبوتر کئی ہزار سال سے گھروں میں بہت شوق سے پالے جاتے ہیں۔ جنگلی کبوتر سیاہی مائل نیلے رنگ کا ہوتا ہے اور اس کی دُم پر سبز اور کالے رنگ کی دھاریاں ہوتی ہیں۔ چونچ عموماً کالی اور ٹانگیں سرخی مائل ہوتی ہیں۔

پالتو کبوتر کی اقسام میں لقا، لوٹن، غفوریہ، گولا، قاصد، مکھی، شیرازی اور چینی قابلِ ذکر ہیں۔ لقا کبوتر کی گردن مور کی طرح پھیلی رہتی ہے۔ یہ گردن کو اکڑا کر بڑے فخر سے چلتا ہے۔ لوٹن، قلا بازیاں کھانے میں ماہر ہوتا ہے۔ اُڑتے ہوئے ایک دم پلٹیاں کھانے لگتا ہے۔ پھر یوں محسوس ہوتا ہے گویا کسی نے اسے زخمی کر دیا ہو۔ گولا کبوتر بہت تیز اُڑتا ہے۔ قاصد کبوتر جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، پرانے وقتوں میں خط لانے اور لے جانے کا کام انجام دیا کرتا تھا۔ اب بھی یہ کام لیا جاتا ہے۔ قاصد کبوتروں کو نامہ کبوتر بھی کہا جاتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی کہ کس ملک میں سب سے پہلے کبوتر کو قاصد کے طور پر استعمال کیا گیا۔ البتہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ طوفانِ نوح کے بعد جب سیلاب کا زور کم ہوا تو حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے کوؤں کو بھیجا کہ وہ پتا لگا کر آئیں کہ پانی

کہاں کہاں سوکھا ہے اور زمین نمودار ہوئی ہے لیکن کوے واپس نہ آئے کیوں کہ وہ گلی سڑی لاشوں کو کھانے میں مگن ہو گئے۔ دوسری بار حضرت نوح علیہ السلام نے کبوتروں کو بھیجا اور کبوتروں نے یہ کام بڑے اچھے طریقے سے انجام دیا اور مطلوبہ اطلاع حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچا دی۔ روئے زمین پر شاید کبوتروں کے ذریعے پیغام رسانی کی یہ پہلی کوشش تھی۔ تب سے اب تک یہ انسان دوست پرندہ کسی نہ کسی صورت میں انسان کے لیے پیغام رسانی کا کام دے رہا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دور میں بھی کبوتر پیغامات پہنچانے کا کام کرتے تھے۔ یونانی اولمپکس کی ابتداء ہوئی تو کھیلوں میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کی ہار جیت کی خبریں بھی کبوتروں ہی کے ذریعے مختلف شہروں میں پہنچائی جاتی تھیں۔

پیغام پہنچانے والے کبوتروں کی اس خصوصیت کے بارے میں مختلف آراء تھیں۔ کچھ ماہرین طیوریات یعنی پرندوں کی عادات و انواع کا علم جاننے والوں کے نزدیک کبوتروں میں چند ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن کی بناء پر وہ سورج اور دوسرے ستاروں کے حوالے درست سمت کا تعین کر لیتے ہیں اور پھر اسی سمت روانہ ہو کر اپنے پہلے ٹھکانوں کی طرف پلٹ آتے ہیں۔ کچھ ماہرین کہتے ہیں کہ کبوتر کے دماغ میں ایسا مقناطیسی مادہ موجود ہے جو زمین کے مقناطیسی میدان کے انحراف کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یوں اس سے کبوتر راستے کی تلاش کر لیتا ہے۔ تاہم ابھی تک اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جا سکا۔

کبوتر صبح صبح آنکھیں کھولتے ہی غٹرغوں غٹرغوں کی آواز نکالتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اللہ ہو، اللہ ہو کا ورد کر کے پیدا کرنے والی ہستی یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہو۔ جنگلی کبوتروں کی قسم عام طور پر مسجدوں، خانقاہوں اور ویران کھنڈروں میں رہنا پسند کرتی ہے جب کہ پالتو کبوتر گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کے گھونسلے عموماً تنکوں، درختوں کی نرم شاخوں اور پتوں وغیرہ سے بنے ہوتے ہیں۔ گھونسلے کی تیاری میں نر اور مادہ دونوں حصہ لیتے ہیں۔

کبوتر کو دانہ دنکا چگنے والا پرندہ بھی کہتے ہیں۔ گیہوں، باجرا، کنگنی، سیم، مٹر اور مسور کے دانے ان کی خوراک ہیں۔ عموماً لوگ مکانوں کی چھتوں پر اناج بکھیر دیتے ہیں اور پانی کے پیالے رکھ دیتے ہیں تا کہ کبوتر اور دوسرے پرندے آئیں اور کھائیں پئیں۔ لوگ کبوتر کو دانہ پانی دینا ثواب کا کام سمجھتے ہیں کیوں اسے ایک درویش پرندہ بھی سمجھا جاتا ہے۔

مختلف کبوتروں کے اُڑنے کی رفتار مختلف ہوتی ہے۔ عام طور پر اُڑنے والے کبوتر 60 کلو میٹر فی گھنٹا کی رفتار سے اُڑتے ہیں، البتہ بعض کبوتروں کی رفتار 90 کلو میٹر فی گھنٹا تک بھی ہوتی ہے۔

کبوتر اپنی قوت شامہ یعنی سونگھنے کی حس سے بھی بہت فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یوں اپنی منزل کی تلاش میں انہیں آسانی رہتی ہے۔ کارنل یونی ورسٹی میں کبوتروں پر ہونے والی تحقیق کے ذریعے اس بات کا پتا چلا ہے کہ کبوتر روشنی کی سمت ہونے والی تبدیلیوں کو فوری محسوس کر لیتے ہیں اور شاید اس احساس سے وہ اپنے ٹھکانوں کا سراغ بھی لگا لیتے ہیں۔ کبوتر ہوا کا دباؤ ناپنے والے آلے کی مانند، فضا میں ہوا کے دباؤ کو محسوس کرتا ہے اور اپنی اس خاصیت کو ریڈار کے طور پر استعمال کر کے اپنی اُڑان کی بلندی اور سمت بھی درست کر لیتا ہے۔ کبوتر کی ایک ماہرانہ خوبی یہ بھی ہے کہ یہ ایسی آواز بھی محسوس کر لیتا ہے جنہیں انسانی کان نہیں سن سکتے۔

پاکستان میں پالتو اور جنگلی دونوں طرز کے کبوتر پائے جاتے ہیں۔ پالتو کبوتر، لوگ کبوتر بازی کے لیے اور شوقیہ پالتے ہیں۔ کبوتر بازی ایک بہت پُرانا اور مقبول کھیل ہے۔ 1850ء کے لگ بھگ کبوتروں کے کھیل نے خاصی ترقی کی۔ کہا جاتا ہے کہ اس کھیل کا آغاز بلجیئم اور برطانیہ سے ہوا۔ کبوتر کے مسلسل پرواز کرنے کا عالمی ریکارڈ بیس گھنٹے دس منٹ کا ہے، جو امریکہ میں قائم ہوا۔

کچھ لوگ گھروں میں کبوتر پالتے ہیں جب کہ مختلف ادارے بھی تجارتی پیمانے پر کام کرتے ہیں۔ اگر آپ کبوتر پالنے کے خواہش مند ہیں تو اس بات کو یقینی بنائیے کہ کبوتر صاف ہوا، روشنی، صاف ستھرا کھانا اور ایسی جگہ رہنا پسند کرتے ہیں جہاں وہ موسم کی سختیوں سے محفوظ رہ سکیں، جب کہ گندے سڑے کھانے، ناکافی ہوا، گندی جگہ اور سورج کی روشنی کی کمی سے یہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

کبوتر پالنے والے شوقین لوگوں کو چاہیے کہ وہ کبوتروں کو ہوا میں اُڑنے کی سہولت دیتے رہیں۔ پنجرے میں بند رکھنے سے ان کی چستی اور پھرتی معدوم ہو جاتی ہے اور پھر یہ مستقل سست رہنے لگتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو تو پھر ان کا پنجرہ کھلی فضا میں اُونچی جگہ اور بڑا بنوانا چاہیے۔ کبوتر نہانے کا بھی بہت شوق رکھتے ہیں، لہٰذا پنجرے میں صاف پانی ایک برتن میں ضرور رکھیے۔

قدرت نے اس انسان دوست پرندے کے گوشت میں انسانی بیماریوں کا علاج رکھا ہے۔ کبوتر کا گوشت فالج، لقوے اور اعصابی کمزوریوں کے لیے بہت مفید ہے۔ کبوتر اپنے مسکن سے محبت کرنے والا پرندہ ہے۔ یہ اُڑ کر خواہ چار ہزار کلومیٹر دُور بھی چلا جائے، پھر بھی اپنا گھر نہیں بھولتا اور واپس اپنی جگہ پہنچ جاتا ہے۔

بوجھو تو جانیں

1- پانی پی کر چلتا ہے
نہیں تو نخرے کرتا ہے

2- چلتا ہے تو تھکتا نہیں
پَر ہیں لیکن اُڑتا نہیں

3- بیج ڈالے نہ ہل چلائے
جب کاٹو خود ہی آئے

(محمد مہدی اکبر غوری، بھکر)

4- شیشے کا گھر ہے، لوہے کا در
منکا سا پیٹ چھوٹا سا سر

5- رہتا ہے وہ ایک جگہ پر
لیکن چلتا رہتا ہے وہ
لوٹ لگائے اور بل کھائے
کیسے من اس میں نہائے

6- ایک جانور ایسا
جس کی دم پر پیسا

(صفا رشید، کراچی)

7- پَر نہیں ہیں اس کے لیکن
بازاروں میں چلتا ہے
اس کا گھر ہے ہر ایک گھر میں
ہر گھر میں یہ رہتا ہے

8- ایک قلعے میں نو دس پریاں
آپس میں سر جوڑے کھڑیاں
قلعہ کے جب کھولو پٹ
جی چاہے کر جائیں چٹ

9- ایک گھڑے میں دو رنگ پانی
بوجھنے والا بڑا گیانی

(ایمن اعجاز، صوابی)

جوابات: 1۔قلم یا پین 2۔پنکھا 3۔بال 4۔بلب
5۔سمندر 6۔مور 7۔روپیہ 8۔مالٹا 9۔انڈہ

بے چاری مرغی!

بی مرغی اپنا انڈہ کہیں بھول گئی ہیں۔ اندہ ہے کہ کہیں مل نہیں رہا۔ کیا آپ کم سے کم وقت میں بی مرغی کو منزل تک پہنچا سکتے ہیں؟

نارمن برفیلے کے پتلے میں رنگ یوں بھریے 1- نیلا 2- سبز 3- ہلکا نیلا 4- خاکی
5- سیاہ 6- نارنجی 7- بھورا

میرا نام سند باد ہے۔ سمندروں میں کثرت سے سفر کرنے کی وجہ سے لوگ مجھے سند باد جہازی بھی کہتے ہیں۔ میرے پہلے سفر کی کہانی کچھ یوں ہے کہ جب میری عمر 22 سال ہوئی تو میرے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ ایک نیک اور خدا سے ڈرنے والے انسان تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے شہر کے سب سے بڑے تاجر بھی تھے۔

مجھے میراث کے طور پر بہت سا مال ملا۔ پھر وہی ہوا جو ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے، دولت کی فراوانی کی وجہ سے میں عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ صبح دن چڑھے تک سویا رہتا، پھر اُٹھ کر عرقِ گلاب ملے پانی سے غسل کرتا، قیمتی پوشاک پہنتا اور پھلوں کا ناشتا کرتا۔ پھر گانے بجانے کی محفلیں شروع ہو جاتیں۔

میری یہ حالت دیکھ کر بہت سے مفت خورے اور خوشامدی دوست میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ ان کا مقصد دن رات میری تعریفیں کر کے مفت کی روٹی کھانا تھا۔ میں نے بھی سخاوت کا حق ادا کیا اور دونوں ہاتھوں سے خوب دولت لٹائی۔ رفتہ رفتہ سب کچھ ختم ہو گیا اور میں امیر سے غریب ہونے لگا۔ جب میرے حالات کمزور ہوئے تو دوست احباب بھی اِدھر اُدھر ہونے لگے۔ میں ان کی بے وفائی پر حیران رہ گیا۔

پھر ایک دن مجھے یہ خیال آیا کہ یوں اپنی دولت کو ضائع کرنا درست نہیں۔ گھر میں بیٹھ کر کھاؤ تو قارون کا خزانہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ چناں چہ یہ سوچا کہ جو دولت باقی رہ گئی ہے، اسے تجارت میں لگانا چاہیے اور جو نفع حاصل ہو اس سے گھر بار چلانا چاہیے۔ اگلے دن میں نے اپنا مال و اسباب بیچا اور دوسرے تاجروں کے ساتھ اپنے شہر کی بندرگاہ سے بصرہ کی طرف روانہ ہوا۔

ہم خلیج فارس کے راستے جزائرِ مشرق کے قریب سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ دورانِ سفر ہم کئی بندرگاہوں پر اترے، پچھلا سامان بیچا اور نیا خریدا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔

ایک دن موسم خوش گوار تھا اور ہمارا جہاز بھی بڑی تیزی سے سمندر کے سینے کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک ہمارے راستے میں ایک چھوٹا سا جزیرہ آ گیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمارے ساتھ ایسا بھی ہو گا۔ کپتان اس جزیرے کو دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے نقشہ نکالا اور حیرت سے بولا: ”نقشے میں تو اس جگہ کوئی جزیرہ نہیں، معلوم نہیں یہ کہاں سے آ گیا۔ کہیں یہ کوئی جادو کا جزیرہ تو نہیں؟“ ہم سب اس کی یہ بات سن کر ہنس پڑے۔

جزیرہ کھیل کے میدان جتنا وسیع تھا اور اس پر زرد رنگ کی نرم نرم گھاس لہرا رہی تھی۔ کپتان نے ملاحوں کو حکم دیا: ”بادبان کھول دو اور جہاز کو جزیرے کے قریب لے جاؤ۔“ پھر ہم سے مخاطب ہو

کر کہنے لگا: ''تم میں سے جو مسافر بھی مختصر وقت کے لیے جزیرے پر جانا چاہے، اسے میری طرف سے اجازت ہے۔'' ہمارے لیے یہ بڑی غیر متوقع بات تھی۔ ہم بیس کے قریب مسافر جزیرے پر اُترے اور اِدھر اُدھر چہل قدمی کرنے لگے۔ کباب ہماری پسندیدہ غذا تھی۔ دو چار آدمی جہاز پر سے لکڑیاں اُتار لائے اور آگ جلانے کی تیاری کرنے لگے۔ ہم بہت خوش تھے اور ایک دوسرے سے خوب مذاق کر رہے تھے۔ ابھی کباب بھوننے شروع کیے تھے کہ جزیرے نے آہستہ آہستہ ہلنا شروع کر دیا۔

پھر دیکھتے ہی دیکھتے جزیرہ اپنی جگہ سے خاصا ہٹ گیا۔ اس کے بعد ہم نے شدید جھٹکا محسوس کیا۔ ہر شخص سمجھا کہ زلزلہ آ رہا ہے۔

اتنے میں جہاز سے کپتان کی آواز سنائی دی: ''جلدی واپس آؤ، ورنہ مچھلی پانی میں چلی جائے گی...... جلدی کرو، جلدی!''

تب ہمیں پتا چلا کہ جسے ہم جزیرہ سمجھ رہے ہیں وہ کوئی بہت بڑی مچھلی تھی جو دھوپ سینکنے کے لیے سمندر کی سطح پر آئی ہوئی تھی۔

مسافروں میں سے جو تیز رفتار تھے وہ تیر کر جہاز پر پہنچ گئے۔ کچھ درمیان میں ڈوبنے لگے اور میں تو ابھی مچھلی کی پشت پر ہی تھا کہ اتنے میں اس عظیم مچھلی نے پانی میں ڈبکی لگانا شروع کر دی۔ بڑا عجیب منظر تھا۔ مچھلی آہستہ آہستہ نیچے لہروں میں جا رہی تھی اور میرے چاروں طرف پانی بلند ہو رہا تھا۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ جزیرہ نہیں بلکہ کوئی مچھلی ہے۔ مجھے اور تو کچھ سمجھ نہ آیا، جلدی سے لکڑی کا ایک ٹکڑا پکڑ لیا جو جلانے کی غرض سے جزیرے پر لایا گیا تھا۔ آخری منظر جو میں نے دیکھا یہ تھا کہ ملاحوں کا شور و غل برپا تھا اور جہاز تیزی سے مجھ سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ اتنی بڑی مچھلی کے غوطہ لگانے سے پانی میں بھونچال سا آ گیا تھا۔ سخت گھبراہٹ کا وقت تھا۔ میں نے لکڑی کو مضبوطی سے اپنے دونوں بازوؤں میں لے لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں کبھی لہروں کے اوپر ہوتا اور کبھی نیچے۔

چند گھنٹے بعد اندھیرا چھا گیا اور بارش شروع ہو گئی۔ میرا خوف سے بُرا حال تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میں ساری رات کہاں بہتا رہا۔ آخر خدا خدا کر کے صبح ہو گئی اور دُور ساحل کی زمین نظر آنے لگی۔ موجیں مجھے آہستہ آہستہ ساحل کی طرف لے گئیں اور میں اوندھے منہ گیلی ریت پر لیٹ گیا۔ سردی، تھکن اور بھوک سے میری جان نکلی ہوئی تھی۔ منہ میں بھی کچھ پانی چلا گیا تھا۔ کتنی ہی دیر اسی حالت میں لیٹا رہا۔ جب سورج ذرا بلند ہوا اور اس کی شعاعوں سے جسم میں کچھ حرارت پیدا ہوئی تو میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سامنے ایک سرسبز جزیرہ پھیلا ہوا تھا۔

میں گذشتہ دن والے واقعے کی وجہ سے اتنا ڈرا ہوا تھا کہ مجھے لگا کہ شاید یہ بھی کوئی مچھلی نہ ہو۔ اسی غرض سے میں نے اپنا قدم زور زور سے چند مرتبہ زمین پر مارا لیکن وہاں گیلی زمین کے سوا کچھ نہ تھا۔ میں نڈھال بھی ہو چکا تھا اور کمزور بھی لیکن پھر بھی ہمت کر کے آگے بڑھا اور کچھ جڑی بوٹیوں سے اپنی بھوک مٹائی۔ جب ذرا جان میں جان آئی تو چل پھر کر جزیرے کا جائزہ لینے لگا۔

جزیرے کے درمیان میں گھاس کا ایک میدان تھا۔ وہاں چند حبشی، گھوڑے چرا رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے نعرہ لگایا اور دوڑ کر میرے قریب آ گئے۔ یہ چار پانچ لمبے قد کے مضبوط جسموں والے لوگ تھے۔ ان کا رنگ سیاہ اور دانت خوب سفید تھے۔ وہ مجھ سے کسی اجنبی زبان میں بات کرنے لگے۔ پہلے تو میں نے اشاروں سے جواب دینے کی کوشش کی۔ جب ان کی زبان سمجھ میں نہ آئی تو آخر تنگ آ کر عربی میں کہا: ''تم کون ہو؟''

ایک بوڑھا حبشی آگے بڑھا اور مجھے عربی میں جواب دینے لگا: ''یہی تو ہم تم سے پوچھ رہے ہیں کہ تم کون ہو اور اس جزیرے پر کیسے آئے؟''

میں نے انہیں اپنی ساری کہانی سنا دی۔ وہ میرے ساتھ بڑے احترام سے پیش آئے اور اپنے خیمے میں جا کر کھانا کھلایا۔ پھر کہنے لگے: ''نوجوان! دل مضبوط رکھو۔ تم ایک بہت رحم دل بادشاہ کے ملک میں ہو۔ ہم سب اس کے ملازم ہیں اور روزانہ یہاں شاہی گھوڑوں کو چرانے لاتے ہیں۔ ہم تمہیں دربار میں پیش کریں گے۔ بادشاہ تمہیں دیکھ کر یقیناً بہت خوش ہوگا۔''

یہ سن کر میری ہمت بڑھی اور پچھلے واقعات کا خوف دُور ہوا۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ شام کو وہ مجھے شاہی محل لے گئے جو آبادی کے درمیان میں بنا ہوا تھا۔

اگلے دن میں بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا۔ بادشاہ نے میری کہانی سن کر مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ تم میرے مہمان ہو جب تک چاہو، یہاں رہو۔ اس کے بعد حکم دیا کہ شاہی مہمان کی حیثیت سے میرا مکمل خیال رکھا جائے۔ چناں چہ میں زندگی کے باقی دن وہاں گزارنے لگا۔ ہر وقت مایوس اور غمگین رہنے لگا کیوں کہ جو کچھ میرے پاس بچا تھا، وہ بھی ضائع ہوگیا اور گھر والے بھی چھوٹ گئے۔ اسی جزیرے پر ایک بندرگاہ بھی تھی جہاں ساری دُنیا سے تجارتی جہاز آتے جاتے تھے۔

بندرگاہ اتنی بڑی تھی کہ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے ہر وقت میلے کا سا سماں رہتا تھا۔ میں اکثر اوقات وہاں چلا جاتا اور کچھ وقت گزار کر واپس آجاتا۔ ایک دن میں دوپہر کے وقت وہاں کھڑا تھا کہ ایک جہاز آکر رُکا۔

ملاحوں نے لنگر ڈال دیا اور تجارتی سامان اُتارنا شروع کر دیا۔ تاجر اپنا اپنا سامان وصول کر کے گوداموں میں لے جانے لگے۔ اچانک میری نظر چند گٹھوں پر پڑی جن پر موٹے حروف سے میرا نام لکھا ہوا تھا۔ اتنے میں مَیں نے کپتان کو یہ کہتے ہوئے سنا، وہ ملاحوں کو حکم دے رہا تھا: ''سندباد کا سامان ادھر علیحدہ ایک طرف رکھنا۔ اس کا سامان دوسرے سامان میں ملنے نہ پائے۔''

میں نے کپتان کی شکل وصورت پر غور کیا تو یاد آگیا کہ یہ وہی ہے جس کے ساتھ میں نے سفر شروع کیا تھا۔ میں دوڑ کر اس کی طرف گیا اور ابتدائی سلام دعا کے بعد بتایا کہ میں ہی سندباد ہوں جس نے اس کے ساتھ سفر شروع کیا تھا اور جزائر مشرق سے ذرا آگے ایک جزیرہ نما مچھلی کی وجہ سے اس سے جُدا ہوگیا تھا۔

کپتان نے میری بات کا یقین نہ کیا اور کہنے لگا کہ جب مچھلی نے پانی میں غوطہ لگایا تو سندباد ہماری آنکھوں کے سامنے ڈوب گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں کوئی دھوکے باز ہوں جو جھوٹ بول کر اس کا مال ہتھیانا چاہتا ہوں۔

میں نے اس سے بحث کی اور کئی نشانیاں بتائیں۔ آخر وہ مطمئن ہوگیا اور میرا سامان میرے حوالے کر دیا۔ میں نے سامان وہیں بندرگاہ کے گودام میں رکھوایا اور واپس شاہی محل کی طرف چل پڑا۔ خوشی سے میرے خون کی گردش تیز ہو رہی تھی اور مجھے ہر چیز اچھی لگ رہی تھی۔ میرا بس نہ چلتا تھا ورنہ اُڑ کر بادشاہ کے پاس پہنچ جاتا اور اسے بتاتا کہ میرا سارا تجارتی سامان اتفاق سے مجھے دوبارہ مل گیا ہے۔

بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ملی تو وہ بھی بہت خوش ہوا اور میرے لیے اچھے خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے بعد میں چند دن مزید اس جزیرے پر رُکا، پھر بادشاہ سے اجازت لے کر رخصت ہوا۔ اس نے تحفے تحائف دے کر مجھے روانہ کیا۔

میں نے راستے میں کئی بندرگاہوں پر اُتر کر اپنا پُرانا مال بیچا اور نیا خریدا۔ آخرکار ایک طویل مدت کے بعد میں اپنے شہر واپس لوٹا۔

جب گھر پہنچا تو قبیلے والوں نے میرا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور ایک بہت بڑی ضیافت بھی کی۔

میرے ساتھ تجارتی سامان کے طور پر صندل کی لکڑی، عود اور برگد کے مرتبان، لونگ، دارچینی، گلاب کے عطریات، کافور، سونے چاندی کے زیورات، ریشم وحریر کے کپڑے اور بہت سے جواہرات تھے۔

یہ سارا سامان ہمارے شہر میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مجھے اس ساری تجارت میں تقریباً ایک لاکھ سونے کے سکوں کا نفع ہوا۔ میں نے ایک باغ خریدا اور اس میں ایک عالی شان مکان بنوایا اور اس طرح آرام وسکون کی زندگی گزارنے لگا۔ جلد ہی میں ماضی کی ساری تکلیفیں اور مصائب بھول گیا اور خوش وخرم رہنے لگا۔ اس طرح میرے پہلے سفر کی داستان مکمل ہوئی۔ ☆☆☆

اُستاد: ''اگر دُنیا میں پانی ختم ہو جائے تو؟''
شاگرد: ''دودھ تو خالص ملے گا۔''

☆☆

باپ (بیٹے سے): ''تم نے ماچس خریدتے وقت دیکھ لیا تھا کہ ماچس بالکل ٹھیک ہے۔''
بیٹا (باپ سے): ''میں نے ساری تیلیاں جلا کر اچھی طرح چیک کر لی تھیں۔''

☆☆

بیٹا (ماں سے): ''امی! ایک روپیہ دے دیں، ایک غریب آدمی کو دینا ہے؟''
ماں: ''وہ آدمی کہاں ہے؟''
بیٹا: ''وہ گلی میں کھڑا قلفیاں بیچ رہا ہے۔'' (محمد مہدی اکبر غوری، بھکر)

ایک پاگل (دوسرے پاگل سے): ''یار! ہمیں پاگل کیوں کہتے ہیں؟''
دوسرا پاگل: ''تم لوگوں کی فکر نہ کرو، یہ لو لیموں لسی بناؤ۔''
(محمد شکیب، بہاول پور)

ایک گدھا کسی گھر کی دیوار سے کان لگا کر کھڑا تھا، ایک بکری کا وہاں سے گزر ہوا تو اس نے پوچھا:
''گدھے بھائی! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''
گدھا: ''اندر دو آدمی جھگڑا کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو گدھے کا بچہ کہہ رہے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ ان میں سے میرا بچہ کون سا ہے؟''

☆☆

ایک سردار سڑک پر جا رہا تھا تو اسے کار کے نیچے کتا لیٹا نظر آیا۔ سردار نے اسے ٹانگ سے پکڑ کر کھینچا اور بولا:
''باہر نکل! ایڈا تو مکینک......''
(محمد اسماعیل، اسلام آباد)

الیکشن کے دن قریب آ رہے تھے۔ ایک صاحب جلسے میں اپنے کونسلر کی تعریف کرتے ہوئے کہہ رہے تھے:
''وہ سمندر ہیں، ہم اس کی موجیں۔ وہ سورج ہیں، ہم اس کی کرنیں ہیں۔ وہ پھول ہیں، ہم اس کی خوش بو ہیں۔''
اچانک پیچھے سے آواز آئی:
''وہ ایک دیگ ہیں اور تم اس کے چمچے۔''

☆☆

ایک بہت لمبا آدمی ایک ریڑھی والے کے پاس گیا اور بولا:
''یہ انگور کیا بھاؤ دے رہے ہو۔''
ریڑھی والا: ''بھائی صاحب! ذرا جھک کر دیکھو! یہ انگور نہیں، سیب ہیں۔''

☆☆

مریض: ''کیا عینک لگوانے کے بعد میں پڑھ سکوں گا؟''
ڈاکٹر: ''جی بالکل۔''
مریض: ''اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ میرے والد بھی میری طرح ان پڑھ ہیں، ایک عینک ان کے لیے بھی بنا دیں۔''
(جواد اعجاز، صوابی)

ایک پاگل (دوسرے پاگل سے):
''جب میں چھوٹا تھا تو مینار پاکستان سے گر گیا تھا۔''
دوسرا پاگل: ''تم مر گئے تھے یا بچ گئے تھے۔''
پہلا پاگل: ''یاد نہیں، میں تو بہت چھوٹا تھا۔'' (ابرار خان ترین، کوئٹہ)

راہ گیر (بچے سے): ''بیٹا! یہ سڑک کدھر جاتی ہے؟''
بچہ: ''جناب! یہ سڑک تو کہیں نہیں جاتی، ہم سڑک سے گزر کر جاتے ہیں۔''

☆☆

تین بیوقوف ایک جگہ چارپائی پر تنگ تنگ ہو کر سوئے ہوئے تھے۔ ایک بیوقوف تنگ آ کر زمین پر لیٹ کر سو گیا تو دوسرا جلدی سے بولا:
''بھائی جگہ بن گئی ہے، اوپر آ کر سو جاؤ۔''

☆☆

ایک لڑکا ایک دعوت سے واپس آیا تو بولا:
''امی! آج میں نے دعوت میں اتنا کھایا کہ واپسی پر گدھے پر بیٹھ کر آیا ہوں۔''
امی: ''بیٹا! اپنے باپ سے کچھ سیکھو، جب وہ کسی دعوت سے واپس آتا تو لوگ اسے چارپائی پر ڈال کر لاتے تھے۔''
(مریم رضوان، راول پنڈی)

ہر کھیل کی اپنی تاریخ ہوتی ہے اور ہر کھیل اپنی ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ کھیلوں میں ایتھلیٹکس بھی شامل ہے۔ یہ کھیل کھیلوں کی بنیادی اور قدیم ترین شکل ہے جس میں عموماً اسٹیمنا، طاقت اور رفتار کو جانچا جاتا ہے۔ تقریباً چار ہزار سال قبل قدیم یونان کے لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف دوڑ لگا کر اس کھیل کا آغاز کیا تھا۔ آج بھی یہ کھیل، کھیلوں کی دُنیا میں منفرد مقام رکھتا ہے اور دُنیا بھر میں مقبولیت کا درجہ اسے حاصل ہے۔

دوسرے کئی کھیلوں کی طرح ایتھلیٹکس کا کھیل بھی پاکستان میں مقبول ہے، تاہم اسے وہ مقبولیت حاصل نہیں جو دوسرے کھیلوں کو حاصل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہوسکتی ہے کہ یہ کھیل ہمارے ہاں بہت زیادہ عام نہیں ہے، حالانکہ یہ کھیل بہت سیدھا سادھا اور سستا کھیل ہے۔ عموماً اس کھیل سے مرد حضرات وابستہ ہیں، خواتین کی تعداد بہت کم ہے۔ بیرونِ ممالک مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی اس کھیل کی شوقین ہیں مگر پاکستان میں صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ یہاں مردوں میں بھی اس کھیل کی مقبولیت خاصی کم ہے تو خواتین میں اس کی مقبولیت اور بھی کم ہے لیکن یہ کتنی حیرت کی بات ہے کہ سیف گیمز چیمپئن میں پاکستان کی نسیم حمید نے قومی کھیلوں کی تیز ترین خاتون ایتھلیٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔

نسیم حمید نے 100 میٹر ریس میں مقررہ مسافت 12.8 سیکنڈز میں طے کی۔ گذشتہ 26 برسوں کے دوران ساؤتھ ایشین گیمز میں ایک منفرد اور قابلِ فخر اعزاز حاصل کرنے والی پہلی پاکستانی خاتون نسیم حمید نے کھیلوں کے شعبے میں اس کھیل میں اپنی جگہ بنائی جہاں پہلے سے مرد حضرات چھائے ہوئے تھے۔ اپنی جگہ بنانا اور پھر کامیابی بھی حاصل کر لینا حیرت انگیز ہی نہیں، ناممکن محسوس ہوتا ہے۔ نسیم حمید نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اور ''ساؤتھ ایشین اسپرنٹ کوئین'' کا خطاب حاصل کیا۔ ایتھلیٹکس کے مقابلوں میں سو میٹر کی دوڑ اہم ترین ایونٹ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس ایونٹ میں ایک پل کی غفلت سال بھر کی محنت پر پانی پھیر دیتی ہے۔ ایتھلیٹ اس مقابلے میں حصہ لینے کے لیے سال بھر محنت کرتا ہے۔ روزانہ پابندی سے دوڑنے کی مشق کرتا ہے، خود کو ذہنی اور جسمانی طور پر چاق و چوبند رکھنے کے لیے جان لڑا دیتا ہے۔ اپنی ٹائمنگ بہتر بنانے کے لیے اپنے اسٹپس درست کرتا ہے اور رفتار کی اُٹھان میں پھرتی لانے کی کوشش کرتا ہے، کیوں کہ سو میٹر

کی دوڑ نو، دس سیکنڈ میں ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر اُٹھان اچھی نہ ہو تو مقابلہ جیتنے کی امید اسی لمحے دم توڑ دیتی ہے۔

ایک اچھے ایتھلیٹ کے لیے مناسب جسمانی تربیت کے ساتھ ساتھ متوازن غذا کا استعمال بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔ کیا نسیم حمید کو اچھی غذا اور مناسب جسمانی تربیت کے مواقع میسر تھے؟ نسیم حمید نے ایک محنت کش گھرانے میں 1987ء میں جنم لیا، جو کراچی کی مضافاتی بستی کورنگی میں 40 گز کے ایک تنگ مکان میں رہائش پذیر ہیں۔ نسیم حمید کے والد راج مستری کا کام کرتے ہیں جو کہ اب بیماری کے باعث زیادہ جسمانی مشقت کے قابل نہیں رہے۔ نسیم کی والدہ گھر میں کاغذ کی تھیلیاں بنا کر فروخت کرتی رہیں اور اپنی غربت کے باوجود نسیم کو نہ صرف تعلیم دلوائی بلکہ اس کے ایتھلیٹ بننے کے شوق کے آگے بھی ساتھ ساتھ چلتے رہے اور یوں محنت کش غریب خاندان کی نسیم حمید کو اس کے والدین نے تعلیم اور کھیل سے اس کے تعلق کا سفر جاری رکھا۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد نسیم حمید آرمی (نان کمیشنڈ) میں ملازم ہو گئی اور محدود آمدنی میں گھر کے پانچ افراد کا گزارہ ہوتا رہا۔ قدم قدم پر زندگی کی نامہربانیوں کے تیر کھانے کے باوجود نسیم حمید نے نہ صرف اپنا شوق زندہ رکھا، بلکہ مسلسل منفرد اعزازات بھی سمیٹتی رہی۔ اس نے مختلف مقابلوں میں تقریباً دو سو تمغے جیت لیے۔ گھر میں انھیں سجانے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، اس لیے وہ اٹیچی کیسوں اور بیگوں میں بند ہیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ نسیم حمید 100 میٹرز کی دوڑ میں فاتح قرار پائی اور اس برق رفتار نوجوان پاکستانی لڑکی کو ''اسپرنٹ کوئین'' قرار دیا گیا۔

ڈھاکہ میں منعقد ہونے والے ساؤتھ ایشین گیمز میں گولڈ میڈل حاصل کرنے والی نسیم حمید جسے ''ساؤتھ ایشین اسپرنٹ کوئین'' کا خطاب دیا گیا۔ وہ اپنے تنگ و تاریک مکان سے نکل کر اپنی پرواز کے لیے ایک وسیع اُفق کا انتخاب کیا اور یوں اُڑان بھری کہ سب ششدر رہ گئے اور اب وہ جنوبی ایشیا کی سب سے تیز رفتار لڑکی ہے۔ ایک سری لنکن اخبار نے اسے ''وومن آف دی ریجن'' کا خطاب دیا۔ سات ملکوں کے درمیان ہونے والے کھیلوں کے مقابلے میں سب سے اہم ایونٹ سو میٹرز کی دوڑ میں طلائی تمغہ حاصل کر کے نسیم حمید نے قومی کھیلوں کی تیز ترین خاتون ایتھلیٹ ہونے کا اعزاز حاصل کیا اور دُنیا بھر میں پاکستان کا نام روشن کیا۔ نسیم حمید کا ملک وقوم کی سربلندی کا پرچم لہرانا اور شہرت کا ڈنکا بجانا، اس بات کی علامت ہے کہ اگر پاکستانی خواتین کھلاڑی کو کھیلوں کے میدان میں آگے بڑھنے کے مواقع دیئے جائیں تو وہ ہر میدان میں کامیابی کے جھنڈے گاڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ نسیم حمید اس کی بہترین مثال ہے۔

ایتھلیٹکس کو ہمارے ملک میں زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہے حالاں کہ اس کھیل میں سخت محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ محنت جسمانی بھی ہے اور ذہنی بھی۔ دُنیا بھر میں ایتھلیٹکس کے کھیل میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی خاصی تعداد میں شامل ہیں اور انہیں خاصی پذیرائی بھی حاصل ہے، مگر ہمارے ملک میں اوّل تو اس کھیل میں مردوں کی تعداد بھی خاصی کم ہے تو پھر خواتین کی تعداد تو ویسے ہی کم ہوتی ہے کہ یہ خالص مردوں کا کھیل سمجھا جاتا ہے۔ خواتین بہت کم تعداد میں اس کھیل سے وابستہ ہیں۔ اگر اس کھیل کو فروغ دیا جائے تو یہ مردوں اور خواتین دونوں کے لیے خاصا مفید کھیل ہے جس میں جسمانی صحت کو خاصی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔

نسیم حمید نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ ایک قابلِ تقلید مثال ہے، جس پر خواتین کو توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ وہ بھی کھیل کے میدان میں کامیابی حاصل کر کے ملک وقوم کا نام روشن کر سکیں۔ اس کھیل کو اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی سطح پر فروغ دیا جا سکتا ہے۔ کھیلوں کے فروغ سے ہی معاشرے میں مثبت سرگرمیوں کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ نوجوان اپنی مثبت سرگرمیوں کے ساتھ آگے بڑھتے ہیں تو معاشرے میں صحت مند سرگرمیاں فروغ پاتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایتھلیٹکس کے کھیل کو بھی دوسرے کھیلوں کے مقابلے میں اہم درجہ دیا جائے۔ اسے صرف قومی کھیلوں میں شمولیت تک ہی محدود نہ رکھا جائے بلکہ تعلیمی اداروں کی سطح پر فروغ دیا جائے تو اس کھیل کی مقبولیت میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ یہ کھیل صرف کھیل ہی نہیں بلکہ جسمانی صحت کے لیے ورزش بھی ہے۔ مرد حضرات کے ساتھ ساتھ خواتین کو بھی اس کھیل میں آگے آنے کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

ملالہ یوسف زئی

یہ 1997ء کے اوائل کی بات ہے جب سوات کے شہر منگورہ کے ایک باسی ضیاء الدین کے آنگن میں رحمتِ خداوندی کی ایک کلی کھلی۔ ضیاء الدین بھی چاہتا تھا کہ اس بار اس کے گھر بیٹی پیدا ہو۔ جب اس کے گھر بیٹی نے جنم لیا تو اس نے اپنی اس بیٹی کا نام بہت پیار سے "ملیل" کے نام پر ملالہ رکھا۔ ملالہ یوسف زئی نے زمانہ طالب علمی میں جب بی بی سی کی ویب سائٹ پر تعلیم کے مسائل پر اپنی ڈائری لکھنا شروع کی تو اس کی تحریروں کو لڑکیوں کی تعلیم کے حق میں ایک توانا آواز کہا گیا اور یوں ملالہ یوسف زئی ایک معروف لکھاری بن گئی۔ اسی عرصے 2009ء میں تحریکِ طالبان پاکستان، لڑکیوں کے سکول بم سے اُڑا رہے تھے اور ملالہ کو دھمکیاں بھی مل رہی تھیں لیکن جب پاک فوج نے سوات میں کارروائی کی تو علاقے میں طالبان کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ طالبان کا سپہ سالار فضل اللہ افغانستان فرار ہوگیا۔ لڑکیوں کے اسکول دوبارہ کھل گئے مگر اکتوبر 2012ء میں اسکول جاتے ہوئے طالبان نے تعلیم کے حق میں آواز بلند کرنے والی کم عمر ملالہ یوسف زئی کے سر میں دو گولیاں داغ دیں مگر قدرت نے اسے بچالیا۔ ملالہ یوسف زئی کو تشویش ناک حالت میں پشاور اسپتال لایا گیا۔ کچھ دنوں بعد بہتر علاج کے لیے راول پنڈی اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ حالت زار سنبھلی تو سابق صدر آصف علی زرداری نے ملالہ کو ہوائی ایمبولینس کے ذریعے برمنگھم (انگلینڈ) بھیج دیا جہاں ملالہ یوسف زئی کو ملکہ الزبتھ ہوسپٹل میں داخل کرا دیا گیا۔ سر میں گولی لگنے سے انگلینڈ جانے تک ملالہ پوری دُنیا کی نئی نسل کی کم عمر ترین رول ماڈل اور توجہ کا مرکز بن گئی۔ بلاشبہ ملالہ یوسف زئی اس واقعے سے پہلے بھی ایک ہونہار لڑکی تھی اور اب بھی ہے جس نے دُنیا بھر میں پاکستان کو ایک نئی شناخت دی ہے مگر سوشل میڈیا پر اس کی ذات کو غلط رنگ بھی دیا گیا کہ وہ غیر ملکی طاقتوں کے لیے کام کر رہی ہے اور علم دشمن طاقتوں نے اس کی آواز کو دبانے کی ایسی ہی کئی کوششیں کیں مگر وہ تھی کہ آگے ہی بڑھتی چلی گئی۔ پھر ایک دن تحریکِ طالبان پاکستان کی طرف سے بھی کہا گیا کہ "ملالہ بچ گئی ہے، اسے ہم دوبارہ مارنے کی کوشش کریں گے۔" اب یہ پوری قوم کو سوچنا ہوگا کہ اگر ہم پاکستان کو واقعی امن کا گہوارہ بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں ملالہ کا ساتھ دینا چاہیے یا اس کا ساتھ چھوڑ دینا چاہیے؟ ملالہ یوسف زئی کے نام سے ایک کتاب "میں ملالہ ہوں" بھی شائع ہوئی۔ حقوق نسواں کے لیے آواز اُٹھانے پر ملالہ یوسف زئی کو کئی ملکی اور غیر ملکی اعزازات اور انعامات سے نوازا گیا۔ 11 اکتوبر 2014ء کی روشن صبح پاکستانیوں کے لیے خوشی کا پیغام لے کر آئی کہ پاکستان کی بیٹی ملالہ یوسف زئی کو امن کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔ ملالہ یوسف زئی کو امن کا نوبل انعام دیئے جانے کی عظیم الشان تقریب اوسلو میں 10 دسمبر 2014ء کو منعقد ہوگی۔

کھوج لگائیے

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر 2014ء ہے۔

نام: ______

شہر: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

دماغ لڑاؤ

ہر حل کے ساتھ کوپن چسپاں کرنا ضروری ہے۔ آخری تاریخ 10 دسمبر 2014ء ہے۔

نام: ______

مقام: ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

ہونہار مصور

دسمبر کا موضوع "مزارِ قائد" ارسال کرنے کی آخری تاریخ 08 دسمبر 2014ء ہے۔

نام ______ عمر ______

مکمل پتا: ______

موبائل نمبر: ______

میری زندگی کے مقاصد

کوپن پُر کرنا اور پاسپورٹ سائز رنگین تصویر بھیجنا ضروری ہے۔

نام ______ شہر ______

مقاصد ______

موبائل نمبر: ______

فتح محمد عرشی

کھڑکھاند گروپ اور سیاست

کھڑکھاند خالص مقامی زبان کا لفظ ہے، جس کا مطلب ہے: شغل میلا، موج مستی اور اس گروپ کا ہر ممبر کھڑکھاندی کہلاتا ہے یعنی شغلی، ہنس مکھ اور زندہ دل......!

آیئے، آج ہم آپ کو کھڑکھاند گروپ سے ملواتے ہیں۔ کھڑکھاند گروپ پانچ دل جلوں پر مشتمل ہے۔ اس گروپ کا سربراہ سر کے بالوں سے بے نیاز ایک کھڑکھاندی ہے، جسے پیار سے گنجے والا کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ میرا کبھی اپنی بیوی سے جھگڑا نہیں ہوا کیوں کہ وہ جو کہتی ہے، میں من و عن تسلیم کر لیتا ہوں۔

ایک دن تو ایک بے تکلف دوست نے پوچھ ہی لیا: ''ارے یار...... سنا ہے، آج کل چولہا آپ نے سنبھالا ہوا ہے۔ آپ کو شرم نہیں آتی؟''

گنجے والا معصومیت سے کہنے لگے: ''جب اسے میرے ساتھ برتن دھوتے ہوئے شرم نہیں آتی تو میں کیوں شرم کروں......؟''

گنجے والا اکثر بڑے فخر سے کہتا: ''ہم نے گھر میں اپنے اپنے کام بانٹ رکھے ہیں۔ تمام بڑے اور اہم فیصلے میں ہی کرتا ہوں، مثلاً امریکہ کو افغانستان سے اپنی فوجیں کب واپس بلانی چاہئیں۔ پاکستان کو کشمیر کی آزادی اور مہنگائی کے خاتمے کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ سب اہم امور میں ہی نمٹاتا ہوں اور دیگر چھوٹے موٹے کام آپ کی بھابھی کے ذمہ ہیں، مثلاً بچوں کو کون سے اسکول میں پڑھانا چاہیے یا میں اپنے والدین سے مہینے میں ایک بار مل سکتا ہوں یا دو بار......؟''

گنجے والا کو نت نئی چیزیں خریدنے کا بے حد شوق ہے۔ ایک بار اس نے اخبار میں ایک اشتہار پڑھا:

''ہم دو ہزار روپے میں ایسی چیز بیچ رہے ہیں، جس کو پہن لینے سے وہ شخص سب کو دیکھ سکے گا، مگر اس کو کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔''

گنجے والا خوشی سے جھوم اُٹھا کہ یہ کوئی ''سلیمانی چادر'' ٹائپ چیز ہوگی۔ اس نے فوراً رقم منی آرڈر کر دی۔ چند دن بعد گنجے والا کو ایک پارسل ملا۔ جب اس نے پارسل کھولا تو اس میں ایک برقع تھا۔

اے بسا آرزو کہ خاک شُدہ!

(افسوس کتنی آرزوئیں خاک ہوگئیں یعنی پوری نہ ہوئیں۔)

دوسرا کھڑکھاندی ہے...... چھوٹے والا۔

واللہ...... کیا طبیعت پائی ہے! اس کا قول ہے کہ جو مزہ مفت کے کھانے میں ہے، وہ کسی اور چیز میں نہیں۔

ایک بار کھڑکھاند گروپ مری کی سیر پر گیا تو ایک دن تین

بندوں کا کھانا پیٹ میں انڈیلنے کے بعد چھوٹے والا مچل گئے (حالانکہ وہ ہر وقت اپنے معدے کی خرابی کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں) کہ ایک عدد تربوز بھی کھالیں۔ مزے کا مزہ اور ہاضمے کا ہاضمہ!

اب تربوز کا وزن کیا تو پتا چلا کہ دس کلوگرام سے کم ملنا محال ہے۔ اچانک چھوٹے والا نے پٹھان سے کہا: ''او خوچہ...... اور یہ جو اُدھر چھوٹے والا پڑا ہے، ریڑھی کے پیچھے...... وہی دے دو۔''

پٹھان نے قہقہہ لگایا اور کہا: ''وہ چھوٹے والا نہیں جی، پورے بارہ کلو کا ہے!''

تربوز چھوٹے والا تھا یا نہیں...... اس کھڑ کھاندی کا نام چھوٹے والا ضرور پڑ گیا......!!!

......اور کھڑ کھاند گروپ کا تیسرا ممبر ہے مبارکاں۔ جی ہاں! حیران نہ ہوں، وہ اسی نام سے مشہور ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ ہر بات پہ کہتے ہیں، مبارکاں مبارکاں...... سنا ہے آپ کی بکری گم ہوگئی ہے!

ایک بار تو اسی عادت کی وجہ سے اچھی خاصی پٹائی بھی ہوگئی۔ پتا ہے کیوں؟ وہ اس طرح کہ ایک فوتگی پر گئے اور حسبِ عادت کہنے لگے: ''مبارکاں مبارکاں...... سنا ہے آپ کے والد صاحب فوت ہوگئے ہیں...... آپ پر مرغی آ گئی!'' (دراصل وہ مرغی کے بے حد شوقین ہیں۔) تو جناب، ان کے اس ڈائیلاگ پر مرغی تو نہیں آئی، البتہ مرحوم کے تین ہٹے کٹے بیٹے مرمت کرنے کے لیے ضرور آ گئے۔ لیکن کہتے ہیں ناں کہ عادتیں سروں کے ساتھ جاتی ہیں، چنانچہ اس سانحے کے بعد بھی ان کی عادت نہیں گئی...... مبارکاں مبارکاں!

چوتھے رکن ہیں ملنگی...... غمِ روزگار نے انہیں وقت سے پہلے اس حال تک پہنچا دیا ہے کہ ایک بار وہ اپنے ابا جان کے ساتھ کسی سے ملنے گئے۔ ان صاحب نے ملنگی سے پوچھا کہ یہ آپ کے کیا لگتے ہیں۔ ملنگی نے کہا: ''یہ میرے ابو ہیں۔''

ان صاحب کا ہنس ہنس کر بُرا حال ہوگیا۔ کہنے لگے: ''میں سمجھا، یہ آپ کے بیٹے ہیں۔'' اس دن ملنگی کو بڑی شرمندگی ہوئی۔

ایک دن ملنگی کا اپنے والد صاحب سے جھگڑا ہوگیا۔ انہوں نے اپنے والد صاحب کی تصویر قبرستان کے گیٹ پر لگا دی اور نیچے لکھ دیا: ''Coming Soon!''

ان کے والد صاحب کو پتا چلا تو انہوں نے کہا: ''بیٹا! اگر تم آئینہ دیکھ لیتے تو میری بجائے اپنی تصویر ایک کھدی ہوئی قبر پر لگاتے اور نیچے یہی ڈائیلاگ لکھتے۔''

اور آخری ممبر ہیں، دادا بڈی...... کھڑ کھاند گروپ کی جان اور روحِ رواں۔ یاروں کے یار، عجوبۂ روزگار، قہقہوں کی بھرمار!

دادا کے لفظ سے ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ کوئی قریب المرگ ہستی ہیں بلکہ وہ ملنگی سے زیادہ جوان نظر آتے ہیں۔ لمبا چولا اور اس پر عجیب وغریب نقش و نگار بنے ہوئے اور پھر ان کا انداز...... ماشاء اللہ...... خدا نظرِ بد سے بچائے۔

حماقتیں چہرے پہ آبشار کی طرح بہتی ہیں اور دعویٰ ہے ذہانت کا!

ایک بار گھر والوں نے ایمرجنسی میں بتایا کہ ایک بکرے کا سر ''ماٹی'' (مٹی کا ایک دیگچے نما برتن) میں پھنس گیا ہے، کیا کریں؟

فرمایا: ''بے وقوفو! بکرے کی گردن کاٹ دو...... سر ''ماٹی'' سے نکل آئے گا۔''

تھوڑی دیر بعد انہوں نے کہا: ''بکرا تو ذبح کر دیا ہے لیکن سر تو اب بھی باہر نہیں نکلا۔''

دادا بڈی نے نادر شاہی حکم جاری کیا: ''اب ماٹی توڑ دو۔''

چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تو بکرے کا سر باہر نکل آیا۔ دادا بڈی نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: ''بس اتنی سی بات تھی......؟ اگر میں نہ ہوتا تو کباڑا کر دیا ہوتا۔ میں سوچتا ہوں، میں نہ ہوا تو تم اپنا نظام کیسے چلاؤ گے؟''

تو یہ تھا کھڑ کھاند گروپ کا تعارف...... اور اب ذرا دل تھام کے بیٹھیے گا، کیوں کہ اب آپ پڑھنے جا رہے ہیں کھڑ کھاند گروپ کے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنے والے کارنامے!

ارے، ہائیں...... ایک بات بتانا تو میں آپ کو بھول ہی گیا۔ ما بدولت کھڑ کھاند گروپ کے اعزازی رکن ہیں۔ ارے بھائی، حیران نہ ہوں...... آپ تک کھڑ کھاند گروپ کے کارنامے بھی تو پہنچانے ہیں۔

بلدیاتی الیکشن کی آمد آمد تھی۔ اچانک دادا بڈی نے ایک انوکھی تجویز پیش کی کہ اس بار کھڑ کھاند گروپ کو بھی الیکشن میں بطورِ امیدوار برائے ناظم اور نائب ناظم حصہ لینا چاہیے۔ سارے کھڑ کھاندی یہ سن کر خوشی سے اُچھل پڑے...... ملنگی نے جوش میں آ کر دادا بڈی کو کندھوں پر اُٹھانے کی کوشش کی اور منہ کے بل گر

پڑا۔ ایک زبردست قہقہہ پڑا۔

دادا بڈی نے اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے جھلا کر کہا: ''کچھ اپنی جنڈڑی (زندگی) پر ترس کرو...... میری تو خیر کوئی بات نہیں لیکن آئندہ ایسا جوش دکھایا تو اپنی گردن تڑوا بیٹھو گے......!''

''چھڈو جی...... کچھ سیاست کی بات کریں اب۔'' گنجے والا نے دخل اندازی کی۔ ''ناظم تو آپ مجھے بنالیں...... ایسی غضب کی تقریر کروں گا کہ لوگ حیران رہ جائیں گے۔''

''ہاہاہا......'' چھوٹے والا نے قہقہہ لگایا۔ ''صرف تقریر نہیں کرنی، لوگوں کو سبز باغ بھی دکھانے ہیں۔''

''سبز کیا...... میں انہیں نیلے پیلے باغ بھی دکھاؤں گا، اس کا میں ماہر ہوں۔'' گنجے والا جوش میں آ گیا۔

''اور میں بنوں گا نائب ناظم......'' دادا بڈی بھلا کہاں پیچھے رہنے والا تھا۔ ''ایسی تقریر کروں گا کہ عوام بے چاری چکرا جائے گی۔''

''مبارکاں مبارکاں......'' اچانک ایک کونے سے آواز آئی۔ ''آپ دونوں پر مرغی آ گئی، اسی خوشی میں......''

دادا بڈی اور گنجے والا اس اچانک ''ڈرون حملے'' سے گھبرا گئے جب کہ چھوٹے والا نے خوشی سے اُچھل کر نعرہ لگایا: ''مبارکاں ساڈا...... زندہ باد!''

ایک ہفتے بعد شہر میں جابجا بینر لگے ہوئے تھے۔

''آپ کے قیمتی ووٹ کا صحیح حقدار...... کھڑکھاند گروپ

ناظم گنجے والا...... نائب ناظم دادا بڈی

مرغی ہے انتخابی نشان...... جو ہے ہر گھر کی شان

ہم مرغی کھانے نکلے ہیں...... آؤ ہمارے ساتھ چلو!''

چند ہی دنوں میں شہر میں کھڑکھاند گروپ کی دھوم مچ گئی...... مبارکاں کہیں سے ایک دیسی مرغ بھی لے آیا تھا، جسے اپنے انتخابی نشان کی نمائندگی کے لیے وہ بائیں ہاتھ سے پکڑ کر سینے سے لگائے رکھتا تھا۔ ایک دن معروف سماجی کارکن چشتی صاحب کا فون آ گیا۔ وہ کھڑکھاند گروپ کی شہرت سے متاثر ہو کر جلسہ کروانا چاہتے تھے اور اسی بہانے کھڑکھاند گروپ کی حمایت کا اعلان کرنا چاہتے تھے۔ اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں......! پہلی پہلی تو دعوت ملی تھی، اس لیے کھڑکھاند گروپ نے فوراً ہی ہامی بھر لی۔ دو دن بعد تین بجے کا ٹائم مقرر ہوا۔ اسی دن سے کھڑکھاند گروپ تیاریوں میں لگ گیا۔ گنجے والا اور دادا بڈی کو اچھی اچھی تقریریں رٹوائی گئیں، جن میں رنگ برنگے خواب دکھائے گئے تھے۔

پنڈال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور کھڑکھاند گروپ سٹیج پر اس حال میں رونق افروز تھا کہ مبارکاں نے دیسی مرغی اپنے سینے سے لگا رکھی تھی۔ چھوٹے والا دانتوں میں خلال کر رہے تھے۔ دادا بڈی اپنے مخصوص کُرتے میں اکڑے ہوئے بیٹھے تھے۔ ملنگی کسی سوچ میں گم شاید خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے تھے، کیوں کہ ان کا سر ایک طرف ڈھلکا ہوا تھا اور گنجے والا بار بار اپنی چندیا پر آنے والا پسینا پونچھ رہے تھے۔ وہ خاصے پریشان لگتے تھے۔

اچانک وہ دادا بڈی کے کان میں جھک کر کہنے لگے: ''یار بڑا پرابلم بن گیا ہے، میری تقریر گم ہوگئی ہے...... اب کیا ہوگا؟''

اس سے پہلے کہ دادا بڈی اسے اپنے لقمانی مشوروں سے نوازتا، سٹیج سیکرٹری نے اچانک انہیں تقریر کے لیے ڈائس پر آنے کی دعوت دے دی۔ گنجے والا یوں بیٹھا رہا جیسے کاٹو تو لہو نہیں بدن میں...... آخر دادا بڈی نے ٹہوکا دیا تو ڈائس پر یوں تشریف لائے جیسے پھانسی گھاٹ پر جا رہے ہوں۔

مائیک کو پکڑا...... کہنا چاہتے تھے: ''میرے بھائیو!''

لیکن آواز ساتھ چھوڑ گئی...... کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ایک بار پھر کھنکارے اور بالآخر ایسی آواز برآمد ہوئی جیسے بکرا ممنا رہا ہو۔ چند ''نامعقول قسم کے لوگ'' ہنسنے لگے۔

مبارکاں کو شرارت سوجھی۔ اس نے اپنے مُرغے کو تھپکی دی اور پنڈال ''ککڑوں کوں'' کی زوردار آواز سے گونج اُٹھا۔

گنجے والا بوکھلا گیا۔ ٹانگیں بید مجنوں کی طرح کانپنے لگیں۔ ساری تقریر آپس میں گڈمڈ ہوگئی۔ آدمی اور مرغی والے ڈائیلاگ ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ گنجے والا نے بدحواس ہو کر آنکھیں بند کرلیں اور شروع ہوگئے:

''میری پیاری مرغیو......! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے لیے اسکول کھولوں گا جہاں آپ کے ننھے منے چوزے تعلیم حاصل کریں گے۔ آپ کے بچوں کے لیے مرغی خانے بنواؤں گا، گندے انڈے آپ کو مفت ملیں گے۔''

کچھ ''بدتمیز'' کھلکھلا کر ہنس پڑے تھے۔

اچانک گنجے والا کو خیال آیا کہ تقریر عام طور پر ایک شعر سے شروع کی جاتی ہے اور اگر شعر علامہ اقبالؒ کا ہو تو کیا کہنے......! یہ سوچتے ہی انہوں نے پورے جوش سے کہنا شروع کیا:

''علامہ اقبالؒ نے ہمارے لیے ہی یہ شعر لکھا تھا......''

اتنا کہتے ہی ان کا جوش صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ علامہ اقبالؒ نے کھڑکھاند گروپ کے لیے کون سا شعر کہا تھا۔ اب جو انہوں نے اپنے انتخابی نشان مرغی کے بارے میں شعر سوچنا شروع کیا تو ان کا گنجا سر گھوم کر رہ گیا لیکن اس سے پہلے کہ انہیں دن میں تارے نظر آتے، اچانک ان کے ذہن میں مرغی تو نہیں البتہ انڈوں کے بارے میں ایک شعر یاد آ گیا۔ انہوں نے بڑے فخر سے اپنا گنجا سر ہلایا اور زور سے بولے: ''ہاں! تو میں فرما رہا تھا کہ علامہ اقبالؒ نے ہمارے یعنی کھڑکھاند گروپ کے لیے ہی یہ شعر لکھا تھا......''

اب شعر پھر ان کے ذہن میں گڈمڈ ہوگیا۔ انہوں نے شعر اس طرح پڑھا۔

''اٹھا کر پھینک دو باہر بڈی پہ
نئی تہذیب کے انڈے ہیں گنجے''

پنڈال میں قہقہوں کا طوفان اُمنڈ پڑا۔ کسی نے حلق پھاڑ کر کہا: ''پاگل ای اوئے......!''

اس سے پہلے کہ حالات قابو سے باہر ہوتے، دادا بڈی نے گنجے والا کو پیچھے سے گھسیٹ لیا اور خود ڈائس سنبھال لیا۔ گنجے والا کرسی پر بیٹھا یوں ہانپ رہا تھا جیسے ''میراتھن ریس'' میں حصہ لے کر آیا ہو۔ طوفانِ بدتمیزی کچھ کم ہوا تو دادا بڈی نے گوہر افشانی کی:

''بھائیو! مرغی ہمارا انتخابی نشان ہے جو ہر گھر کی شان ہے۔ مرغی بھی کھائیں اور انڈے بھی کھائیں، گندے ہو جائیں تو کسی سیاسی جلسے میں لے جائیں...... اُف!'' جوش میں کتنا غلط ڈائیلاگ منہ سے نکل گیا تھا مگر اب کیا ہوسکتا تھا؟

اسی لمحے ایک انڈا سنسناتا ہوا آیا لیکن دادا بڈی نے اپنے ہوش و حواس قائم رکھے اور جھکائی دے کر خود کو بچا لیا۔ انڈا سیدھا گنجے والا کے ماتھے سے آ کر ٹکرایا اور اس کے منہ پر افریقی جنگلیوں جیسے نقش و نگار بنا ڈالے۔ گنجے والا کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکل گئی۔

مبارکاں نے چلّا کر کہا: ''مبارکاں مبارکاں!''

اتنے میں ایک ماہر نشانہ باز دادا بڈی کو گلے سڑے مالٹے سے نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ دادا بڈی واپس بھاگے لیکن اتنے میں مجمع قابو سے باہر ہو چکا تھا۔ گندے انڈے اور مالٹے بارش کی طرح برسنے لگے تھے۔ سٹیج پر ایک بھگدڑ مچ گئی تھی۔ کھڑکھاند گروپ نے راہِ فرار اختیار کی۔ اس افراتفری میں مبارکاں کی مرغی بھی اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ چلّاتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ''ہائے میری دیسی مرغی...... پورے ہزار روپے کی تھی......!''

''مبارکاں مبارکاں!'' چھوٹے والا نے جل بھن کر کہا۔ اسے دراصل یہی غم کھائے جا رہا تھا کہ حلوہ بھی ہاتھ سے گیا۔ اگر چشتی صاحب حلوہ پہلے کھلا دیتے تو کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑتا؟ ☆☆

آپ بھی لکھیے

اصلی تازگی

(اسد امین، گوجرانوالہ)

یاسر کو آج اپنے ابا کی بہت یاد آ رہی تھی۔ ان کی وفات کو آج پورا ایک سال ہو گیا تھا۔ یاسر کی عمر اس وقت کوئی بائیس سال کی تھی۔ وہ تعلیم سے فارغ ہو کر اس دفتر میں کام کرنے لگ گیا تھا جہاں اس کے ابو کام کیا کرتے تھے۔ دفتر میں سب لوگ بہت تعاون کرنے والے تھے۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ یاسر کے ابو ماجد حسین کے دوست یا واقف کار تھے، اس لیے وہ بھی یاسر کا خیال رکھتے تھے۔ یاسر کی ماں کو آج اپنے گھر کی صفائی کے دوران اس کے ابو کی پرانی تصاویر ملی تھیں جنھیں دیکھ کر دونوں ماں بیٹا اُداس ہو گئے تھے۔ آج سارا دن دفتر میں بھی یاسر بجھا بجھا سا رہا۔

یاسر کے دفتر میں کام کرنے والے لوگ جہاں اس کے ساتھ تعاون کرتے تھے، وہاں اسے بار بار یہ بھی کہتے تھے کہ جیسے تمہارے ابو ماجد حسین نے کام کیا ہے، ویسا تم نہیں کرتے۔ خاص کر یاسر کا باس تو اسے سستی اور کاہلی کا طعنہ دیتا رہتا تھا۔ یاسر کی سمجھ میں بالکل نہیں آتا تھا کہ اسے کیوں اس طرح کی باتیں سننا پڑتی ہیں۔

یاسر کے ساتھ کام کرنے والے ایک آدمی تھے جن کا نام عادل حسین تھا۔ وہ یاسر سے بہت شفقت کیا کرتے تھے۔ عادل صاحب نے ایک دن یاسر کو بتایا کہ ''تمہارے ابو جب دفتر آیا کرتے تو بہت ہشاش بشاش اور تروتازہ دکھائی دیا کرتے۔ سارا دن ان کے چہرے پر ایک مسکراہٹ رہتی اور وہ سب کام بڑی خوش دلی سے کیا کرتے۔ نہ صرف اپنا کام نمٹاتے بلکہ دوسروں کے کام میں بھی ان کی مدد کر دیا کرتے تھے جب کہ تمہارے اندر یہ باتیں نہیں ہیں۔''

یاسر یہ باتیں سن کر ان سے کہنے لگا۔

''دیکھیں انکل، میں تھوڑا لیٹ بستر سے اُٹھتا ہوں لیکن اُٹھتے ہی دفتر کی طرف دوڑ لگا دیتا ہوں۔ ماں مجھے ناشتے کے لیے کہتی ہیں لیکن میں ان کی ایک نہیں سنتا اور بھاگم بھاگ دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ ذرا بھی لیٹ نہیں ہوتا اور آتے ہی کام پر لگ جاتا ہوں۔ ہاں، کبھی کبھار کچھ کمزوری سی محسوس ہوتی ہے۔ ایک دو دفعہ سر بھی چکرایا ہے لیکن میں پھر بھی اپنے کام سے کوتاہی نہیں کرتا۔''

ابھی وہ دونوں یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ چھٹی کا وقت ہو گیا اور وہ اپنے راستوں پر چل پڑے۔ دن اسی طرح گزرتے گئے اور دفتر میں یاسر کی پہچان ایک سست اور نکمے ملازم کی حیثیت سے ہونے لگی۔ باس بھی اس سے نالاں رہنے لگا۔ دوسرے لوگ بھی اب اس سے تعاون کم کرنے لگے تھے، یہاں تک کہ دفتر میں یاسر کو کام سے نکالے جانے کی باتیں ہونے لگیں۔ یاسر پریشان رہنے لگا۔ سوچ سوچ کر وہ اور بھی چڑچڑا ہو گیا۔ اس کا بلڈ پریشر بھی ہائی رہنے لگا تھا۔ اس نے بہت سے ڈاکٹروں سے بھی رابطہ کیا۔ ان ڈاکٹروں نے اسے بہت سے دوائیں کھانے کے لیے دے دیں۔ دوائیں کھانے سے اس کی طبیعت مزید خراب رہنے لگی۔ ایک دن اپنی ماں سے باتیں کرتے ہوئے یاسر نے پوچھا: ''امی جان! آخر ابو جان میں کون سی ایسی خوبی تھی جس کی وجہ سے سب ان کی تعریف کرتے ہیں۔''

یاسر کی امی نماز پڑھ کر اٹھی تھیں۔ انھوں نے یاسر کے پورے جسم پر ایک پھونک ماری اور یاسر کو بتایا کہ اس کے ابو کیسے ہشاش بشاش رہتے تھے۔ یاسر کو بات سمجھ میں آ گئی۔ اگلی صبح جب وہ اُٹھا تو ابھی فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ اس نے بستر کو چھوڑا اور مسجد کی طرف چل دیا۔ نماز کے بعد اس نے کچھ دیر قرآن مجید کی تلاوت کی اور پھر صبح کی سیر کرنے کے لیے نکل گیا۔ واپس آیا تو اسے بھوک لگ رہی تھی۔ اس کی ماں نے ناشتا تیار کر رکھا تھا۔ یاسر نے غسل کیا، پھر اس نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ آج اسے اپنے اندر ایک نئی قوت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ وقت سے پہلے ہی دفتر پہنچ گیا اور سب سے ایک خوش دلی اور تروتازگی والی مسکراہٹ کے ساتھ ملا۔ اس نے اپنا کام بہت جلد نمٹا لیا اور اب وہ اپنے ابو کی طرح دوسروں کے کام میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ (پہلا انعام 195 روپے کی کتب)

دودھ میں پانی

(محمد دانیال، راول پنڈی)

ایک گوالا پہاڑ کے دامن میں رہتا تھا، وہیں اپنی گائیں بھی رکھتا تھا۔ دن بھر گائیں اِدھر اُدھر گھاس چرتی رہتیں۔ شام سے ذرا پہلے دودھ دوہتا اور اس میں بہت سا پانی ملا دیتا۔ قریب ہی ایک قصبہ تھا، شام کے اندھیرے میں دودھ لے آتا اور خالص دودھ کی صدا لگا کر بیچ دیتا۔ ضرورت کی چیزیں خریدتا اور واپس اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتا۔ دودھ کے گاہک اکثر شکایت کرتے کہ دودھ پتلا ہے۔ اس میں پانی نہ ملایا کرو مگر گوالا تھا کہ اس کان سنتا، اس کان اُڑا دیتا اور کہتا کہ دودھ خشک تو ہوتا ہی نہیں۔ دودھ میں پانی کی ملاوٹ قدرتی امر ہے، میں پانی ملانے والا کون ہوں۔

اسی طرح ایک عرصہ گزر گیا۔ گوالے کے پاس بہت سا روپیہ جمع ہو گیا اور اسے اپنی دولت مندی کا احساس ہونے لگا۔ اب وہ تن کر چلتا اور اینٹھا اینٹھا پھرتا۔ کسی کی شکایت پر کان نہ دھرتا۔ لالچ بڑھتا گیا اور وہ دودھ میں پہلے سے زیادہ پانی ملانے لگا۔ ایک دن یکا یک سیاہ گھٹا اٹھی اور آسمان پر چھا گئی۔ گھٹا نے سورج کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور ہر طرف تاریک شامیانہ تان دیا۔ گوالا بہت خوش ہوا کہ اب مینہ برسے گا، گھاس بڑھے گی، گائیں کھائیں گی اور زیادہ دودھ دیں گی۔ بس وارے نیارے ہو جائیں گے۔

بادل گرجا، بجلی چمکی، بوندیں ٹپکیں اور موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہو گیا۔ پہاڑوں سے پانی کا سیلاب اُترا اور اس شدت سے بڑھا کہ گوالے کی ساری گائیں اور جو کچھ گھر کا سامان تھا، بہا کر لے گیا۔

اب گوالے کے پاس نہ گائیں تھیں نہ نقدی، پریشان تھا اور گھبراہٹ میں ہر شخص سے کہتا تھا کہ میں نے ایسا سیلاب نہ کبھی دیکھا تھا، نہ سنا تھا۔ معلوم نہیں اتنا پانی کہاں سے آ گیا۔

ایک عقل مند نے سنا تو کہا: ''یہ وہی پانی ہے جو تم دودھ میں ملایا کرتے تھے۔ خدا نے اسی پانی کو سیلاب بنایا اور تمہیں بے ایمانی اور بددیانتی کی سزا دی۔'' (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)

ذرا سوچیے!!!

(حافظ حمیرا اصغر، سیال مرالی)

شربتی آنکھوں والی وہ سادہ سی لڑکی جس کا نام ''پری وش'' تھا جو سنگلاخ پہاڑوں میں بستی تھی لیکن اس کے باوجود نرم و نازک احساسات میں گندھا وجود رکھتی تھی۔ اس کی کل کائنات سمٹ کر پہاڑوں سے گھرے اس چھوٹے سے گاؤں تک محدود تھی جہاں ایک چھوٹے سے گھر میں وہ اپنے محبت کرنے والے ماں باپ اور تین چھوٹے چھوٹے بھائیوں کے ساتھ رہتی تھی۔ سرخ و سفید رنگت اور گول مٹول چہروں والے شرارتی بھائی اس کو پوری دُنیا سے زیادہ عزیز تھے۔ وہ روز رات کو انہیں نئی کہانی سناتی۔ اپنے تصور میں آباد دُنیا کی کہانی۔ یہ دُنیا وہ تھی جہاں پیار تھا، محبت تھی، سکون تھا۔ وہ اپنی اس دُنیا میں بہت خوش تھی۔ پھر اچانک اس کے اردگرد عجیب سی باتیں ہونے لگیں۔ بموں کی، میزائلوں کی، خوف ناک ہتھیاروں کی باتیں۔ اسے خوف سا محسوس ہوتا لیکن پھر وہ سوچتی کہ یہ سب کچھ دنوں کی باتیں ہیں، جلد ہی لوگ سب کچھ بھول جائیں گے۔ ایسی ہی سوچوں میں گم ایک رات وہ سوئی تو صبح بیدار ہونے پر اسے پتا چلا کہ اس کی تو کائنات ہی اُجڑ گئی۔ اس کے پیاروں کے وجود ریزہ ریزہ ہو کر ہوا میں بکھر گئے۔ اس کے معصوم صورت ننھے بھائی جو اس کی آنکھوں سے دُنیا کو دیکھتے تھے۔ کلسٹر بموں اور ٹام ہاک کروز میزائلوں کی زد میں آ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے تو شربتی آنکھوں والی سادہ سی لڑکی اپنے حواس کھو بیٹھی۔ قندھار شہر کی گلیوں میں کبھی ہنسنے اور کبھی رونے والی دیوانی لڑکی کو اب بھی یقین نہیں کہ دُنیا کا یہ روپ بھی ہو سکتا ہے۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس وقت اس نازک اندام لڑکی کے احساسات کیا ہوں گے؟ ہمیں اس کے احساسات سے کیا لینا دینا۔ ہماری تو اپنی زندگی ہے، اپنی خوشیاں، اپنے احساسات۔ ہمیں تو شاید لبنان کے ان بچیس بچوں کی شہادت پر بھی آنسو بہانے یاد نہیں رہے کیوں کہ ہم لوگ تو محفوظ ہیں۔ یہ خون آشام مناظر اب ہماری بصارتوں کو کیوں نہیں جھنجھوڑتے، جھریوں بھرے چہروں پر رقم درد کی داستانیں پڑھ کر بھی ہماری آنکھیں نم کیوں نہیں ہوتیں؟ پھول جیسے معصوم بچوں کی بے گوروکفن لاشیں بھی ہمیں اس حقیقت سے روشناس کیوں نہیں کراتیں کہ ہمارا سب کا مشترکہ جرم ایک ہی ہے۔ ہمارا مشترکہ دشمن بھی ایک ہی ہے۔ پھر بھی ہم سب ابھی تک ایرانی، افغانی، لبنانی، پاکستانی کیوں ہیں؟ ہم صرف ''مسلمان'' کیوں نہیں؟

ہم لوگ بے بس نہیں ہے، بے حس ہیں۔ ذرا سوچیں اور غور کریں۔ آپ کے پاس ابھی بھی وقت ہے کیوں کہ کچھ لوگوں کو آج بھی ہماری ضرورت ہے۔ ان بہنوں کو جو آج بھی محمد بن قاسم جیسے بھائیوں کی منتظر ہیں، ان ماؤں کو جن کے جگر گوشے دینِ اسلام اور وطن کی آن پہ قربان ہو کر شہادت کا درجہ پا گئے۔ قصرِ الحمرا کے در و دیوار آج بھی مسلمانوں کے گھوڑوں کے قدموں کی چاپ سننے کو بے قرار ہیں۔ مسجدِ اقصیٰ آج بھی سلطان صلاح الدین ایوبی جیسے کسی دلیر اور بہادر فرزند کا انتظار کر رہی ہے۔ ہم آج بھی اپنا کھویا ہوا وقار اور رُعب و دبدبہ حاصل کر سکتے ہیں اگر ہمارے حکمران آج بھی حضرت عمر فاروقؓ کے کردار کی تقلید کریں۔ اگر ہم سب ایک ہو جائیں اور ہم میں ذات پات کا کوئی فرق نہ ہو۔ اگر ہم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کریں اور صحابہ کرام عنہم اجمعین کے نقشِ قدم پر چلنے والے بن جائیں۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

تھے تو وہ آباء تمہارے مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو

☆☆

خدا تعالیٰ سرزمینِ پاک کو ہمیشہ قائم و دائم رکھے۔

خدا کرے کہ میری ارضِ پاک پر اُترے
وہ فصلِ گل جسے اندیشۂ زوال نہ ہو!

(تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)

آدھا انعام

(عظیم ڈوگر، ملتان)

داور کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد وہ پڑھائی چھوڑ کر اپنے چھوٹے سے شہر کے ایک موٹر مکینک کے پاس یومیہ اجرت پر کام کرنے لگا۔ وہ محنتی اور دیانت دار ہونے کے ساتھ ساتھ سچا اور کھرا انسان بھی تھا۔ ابھی اس کی عمر پندرہ برس تھی کہ والد کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ گھر میں اب اس کی بیوہ ماں اور ایک چھوٹی بہن رہ گئی تھی۔ داور کسی طرح زندگی کی گاڑی کھینچ رہا تھا کہ ایک روز اس کا اپنے مالک سے جھگڑا ہو گیا۔ اُستاد نے داور کو ایک موٹر سائیکل میں دھوکے سے غیر معیاری پرزہ ڈال کر اس کے مالک سے زیادہ رقم بٹورنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ اُستاد نے غصے سے اسے کام سے نکال دیا۔ وہ اپنا حساب کتاب کر کے دُکان سے نکلا اور ایک ہوٹل پر جا کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا۔ اسی پریشانی میں اس نے اپنے لیے ایک کپ چائے کا آرڈر دیا۔ اس کے قریب ہی ایک آدمی کسی سے موبائل فون پر بات کر رہا تھا۔ اس کی پشت داور کی طرف تھی اور وہ اس کی موجودگی سے بے خبر تھا۔ اگرچہ وہ بہت آہستہ آہستہ آواز میں بول رہا تھا مگر داور اسے سن سکتا تھا۔ وہ کسی کے اغواء کی بات کر رہا تھا۔ ”سیٹھ عرفان...... وہی مل اونر...... ہاں بیس سال کا ایک ہی بیٹا ہے۔ احمد نام ہے اس کا۔ ہاں، پیسے بھی تمہیں مل جائیں گے مگر یاد رکھو کوئی گڑبڑ نہ ہو۔ چلو ٹھیک ہے، اب بس فون بند کرو۔ کالج کی چھٹی ہونے والی ہے، تم تیار رہو۔“ اور پھر ہوں ہاں کی آوازیں داور کے کانوں میں پڑنے لگیں۔ داور کی چائے آ چکی تھی۔ اس دوران وہ آدمی بات ختم کر کے وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ سیٹھ عرفان ان کے علاقے کی ایک مشہور شخصیت تھی۔ وہ ایک بڑے کارخانہ دار تھے اور بہت ہی سخی اور شفیق انسان تھے۔ داور کو یقین تھا کہ وہ ان کے بیٹے کو اغواء کرنے کی بات کر رہا تھا۔

داور سوچ رہا تھا کہ اتنے اچھے انسان کے بیٹے کو اغواء کر کے اس سے رقم بٹوری جائے، یہ غلط ہے۔ مجھے یہ واردات ہونے سے پہلے ہی سیٹھ عرفان کو آگاہ کرنا ہوگا کیوں کہ احمد ان کا اکلوتا بیٹا ہے اور وہ اپنی اکلوتی اولاد کے لیے کوئی بھی قیمت ادا کر سکتے ہیں لیکن میں ان اغواء کاروں کو ہرگز یہ گھناؤنا کھیل نہیں کھیلنے دوں گا۔ اسی مقصد کو دل میں لیے وہ اُٹھا اور ہوٹل سے باہر آ گیا۔ اس کے قدم تیزی سے سیٹھ عرفان کے دفتر کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ جب وہ فیکٹری کے گیٹ پر پہنچا تو گارڈ نے اسے اندر جانے سے روک دیا۔ گارڈ نے بتایا کہ میرے پاس سیٹھ صاحب کے لیے ایک اہم خبر ہے اور میرا سیٹھ صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے لیکن گارڈ نے پھر بھی اسے اندر جانے سے منع کر دیا۔ جب وہ مایوس ہو کر واپس لوٹنے لگا تو گارڈ نے کہا: ”میری ایک شرط ہے۔ اگر اس شرط کو تم پورا کرو تو اندر جا سکتے ہو۔“ داور نے سوالیہ نظروں سے گارڈ کی طرف دیکھا تو گارڈ نے اسے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ وہ بہت لالچی تھا کہنے لگا۔ ”میرے سیٹھ صاحب بہت سخی آدمی ہیں، ہو سکتا ہے تمہارے پاس جو خبر ہے وہ واقعی ان کے لیے اہم ہو اور وہ خوش ہو کر تمہیں کچھ انعام دے دیں۔ اس لیے تم مجھ سے

وعدہ کرو کہ وہ تمہیں جو بھی انعام دیں گے تم اس میں سے آدھا انعام مجھے دو گے۔" داور کو انعام کی نہیں بلکہ ایک معصوم کی جان کی فکر تھی جو صرف کچھ ہی منٹوں میں ظالموں کے چنگل میں پھنس سکتی تھی، لہٰذا کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ راضی ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد داور، سیٹھ صاحب اور ان کے اسسٹنٹ کے سامنے تھا۔ اس نے پورا واقعہ سنا دیا۔ سیٹھ صاحب نے پولیس کو فون کر کے مدد کی درخواست کی۔ اس کے بعد انہوں نے داور سے کہا: "میں تمہیں کچھ انعام دینا چاہتا ہوں۔" داور نے کہا کہ اسے انعام کے طور پر پچاس تھپڑ مارے جائیں۔ یہ سن کر سیٹھ صاحب حیران ہو گئے اور اس کی وضاحت چاہی لیکن داور نے کہا کہ پہلے اپنا وعدہ پورا کریں۔ اس کے اصرار پر انہوں نے اپنے ملازم سے کہا کہ اس آدمی کے تھپڑ مارے۔ پچیس تھپڑ کھانے کے بعد داور نے اسے رُکنے کو کہا اور بولا: "جناب! باقی تھپڑ اپنے کارخانے کے گیٹ پر موجود چوکی دار کو لگوائیں کیوں کہ میں اس سے وعدہ کر کے آیا ہوں کہ مجھے جو انعام ملے گا، اس میں سے آدھا اسے دوں گا۔ سیٹھ صاحب ساری بات سمجھ گئے۔ انہوں نے گارڈ کو بلوایا اور اس کی خوب بے عزتی کی۔ انہوں نے بے ایمانی کی سزا دیتے ہوئے اسے ملازمت سے فارغ کر دیا۔

اُدھر پولیس کے سادہ لباس میں موجود اہلکاروں نے تین ملزموں کو گرفتار کیا جو ایک کار میں کالج سے گھر جاتے ہوئے سیٹھ صاحب کے بیٹے کو اغواء کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سیٹھ صاحب نے اگلے دن دوبارہ داور سے رابطہ کیا اور اس کے حالات جاننے کے بعد اسے اپنے کارخانے میں ملازم رکھ لیا۔ انہوں نے داور کی بہن کی شادی کے تمام اخراجات بھی پورے کیے۔ آج داور کے گھر میں جشن کا سماں تھا۔ اس کی امی نے پورے محلے میں مٹھائی بانٹی اور اپنے بیٹے کو اچھی ملازمت ملنے پر خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا۔

(چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)

وفاداری

(ثمرہ احمد، ڈسکہ سیال کوٹ)

سمبا ایک خوب صورت بلا تھا جس کی مالکن طاہرہ تھی۔ طاہرہ نے سمبا کو تب گود لیا جب وہ ابھی نومولود تھا۔ گورا چٹا، ہلکا بادامی رنگ لیے جب وہ کھیلتا تو طاہرہ کے مانو دل کی کلیاں کھل کھل جاتیں۔ اس کا تو لاڈلہ تھا ہی، گھر بھر کی بھی آنکھوں کا تارا بن چکا تھا۔ یونہی کھیلتے کھلاتے وہ دو برس کا ہوگیا۔ برسات کا موسم تھا، ہر طرف حشرات الارض بکھرے پڑے تھے۔ طاہرہ اپنی بہن کے ساتھ موبائل پہ باتیں کرنے میں مگن تھی کہ اچانک اس نے دیکھا، سمبا کسی رسّی کے ساتھ کھینچا تانی میں مگن ہے۔ غور کرنے پر نظر آیا تو طاہرہ کی سٹی گم ہوگئی کیوں کہ وہ رسّی نہیں سانپ تھا۔ پورا گز لمبا اور خطرناک بھی، گھر پہ کوئی بھی موجود نہ تھا۔ طاہرہ کے تو اوسان خطا ہوگئے۔ پلنگ سے چھلانگ لگا کر نیچے بھاگی اور امی امی کا شور مچانے لگی کہ سانپ آ گیا۔ امی گھر پہ نہیں تھی۔ جلدی جلدی ہمسایوں کے گھر سے امی کو بلانے میں کامیاب ہوئی تو ساتھ ہی ہمسائے انکل جاوید بٹ بھی دوڑے چلے آئے۔ اتنی دیر میں سمبا سانپ کی دُرگت بنا چکا تھا۔ اسے ادھ موا کر کے کھیل میں مصروف تھا۔ دراصل قدرت اس کے ذریعے اس کی مالکن کو محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ سب نے ڈنڈے پکڑے اور سانپ کو مارنے لگے۔ سمبا اب ایک طرف ہوگیا اور سانپ کو انکل جاوید نے ختم کر دیا۔ سب کی سانس میں سانس میں آئی اور انکل نے سمبا کی بہادری کو خراجِ تحسین پیش کیا کہ آج سمبا کی وفاداری نے اس کی مالکن کی جان بچانے میں واقعی اہم کردار ادا کیا کیوں کہ اگر یہ بلا موجود نہ ہوتا تو سانپ سیدھا طاہرہ کی طرف ہی آتا جو قریب ہی لیٹی ہوئی تھی۔ سمبا کا بھی پھر ٹریٹ منٹ کیا گیا تا کہ زہر اسے تکلیف نہ دے، اگر اس کے دانتوں میں لگا ہو۔ آج اس شان دار وفاداری کی مثال کم ہی ملتی ہے اور انسان جو جانوروں کو نظر انداز کرتا اور حقیر خیال کرتا ہے، یہ نہیں جانتا کہ وفادار جانور مالک کی جان اپنی جان پر کھیل کر بچا لیتے ہیں۔ سچ ہے کہ:

نہیں ہے نکمی کوئی چیز زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے اس کارخانے میں

(پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرّہ دیوتا ہے
ارادے جن کے پختہ ہوں، نظر جن کی خدا پر ہو
تلاطم خیز موجوں سے وہ گھبرایا نہیں کرتے
(مریم رضوان، راولپنڈی)

ٹ	ی	ک	ط	پ	ر	ن	د	ہ	ج
ض	ڑ	ڈ	ت	م	چ	ق	ل	ع	ڑ
ذ	گ	ر	گ	ا	د	و	س	گ	ش
س	پ	چ	ع	ق	ہ	ص	پ	د	ف
ج	ن	ف	و	خ	و	ر	ا	ک	ء
ا	پ	غ	ر	ی	ظ	ب	ن	س	ن
و	ط	ض	ت	س	خ	غ	ش	ع	ا
ٹ	ج	ن	گ	ل	م	د	ب	ر	ت
ژ	ا	ص	ش	ے	ز	ا	ط	گ	پ
ز	ی	و	ج	ت	ل	د	ح	ص	ک

آپ نے حروف ملا کر دس الفاظ تلاش کرنے ہیں۔ آپ ان الفاظ کو دائیں سے بائیں، بائیں سے دائیں، اُوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر تلاش کر سکتے ہیں۔ آپ کے پاس وقت دس منٹ کا ہے۔ جن الفاظ کو آپ نے تلاش کرنا ہے وہ یہ ہیں:

سوداگر، کپتان، خوراک، عورت، تجویز، پگڑی، جنگل، بغداد، پرندہ، سجاوٹ

پرانے زمانے کی بات ہے، ملک شام پر ایک نیک دل اور انصاف پسند بادشاہ حکومت کرتا تھا لیکن وہ جو کسی نے کہا ہے کہ خدا کی شان نرالی ہے، گلاب کے پودے میں کانٹے لگتے ہیں، اس بادشاہ کا بیٹا بہت مغرور اور ضدی تھا۔

شہزادے کا نام تو عادل تھا جس کا مطلب انصاف کرنے والا ہے، لیکن انصاف سے اسے کوئی تعلق نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عزت اور عیش آرام صرف بادشاہوں کے لیے ہے۔ عام لوگوں کا کام بادشاہوں کی خدمت کرنا اور ان کا حکم ماننا ہے۔ اپنے اس غلط خیال کی وجہ سے وہ اپنے اُستادوں تک کی عزت نہ کرتا تھا۔

بادشاہ اپنے بیٹے کی بُری عادتوں کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ غرور کرنے والے چاہے بادشاہ ہی کیوں نہ ہوں، ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ ان کے بُرے برتاؤ کی وجہ سے لوگ ان کے دشمن بن جاتے ہیں اور جب بھی موقع ملتا ہے اپنی تکلیفوں اور توہین کا بدلہ ضرور لیتے ہیں۔

بادشاہ چاہتا تھا، کسی طرح شہزادے کے دل سے غرور نکل جائے اور وہ دوسروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے لگے۔ اس نے ضدی اور مغرور شہزادے کو تعلیم دینے کے لیے ملک کے بہت قابل لوگوں کو مقرر کیا تھا لیکن وہ ان سے کچھ سیکھتا ہی نہ تھا۔ جب بھی کوئی اُستاد اسے سبق پڑھانا چاہتا وہ ناراض ہو جاتا اور بگڑ کر کہتا:

”آپ ہماری رعایا ہیں۔ آپ ہم سے زیادہ عقل مند کیسے ہو سکتے ہیں؟ ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے گھر چلے جایئے۔ جو کچھ سیکھنا ہوگا، ہم خود سیکھ لیں گے۔“

ایسے بگڑے ہوئے بچوں کا ایک اُستاد ڈنڈا بھی ہے، جسے اسکولوں میں ”مولا بخش“ کہا جاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ اُستاد بھی کچھ نہ کر سکتا تھا کیوں کہ بادشاہ اور ملکہ اپنے اکلوتے بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کا حال تو یہ تھا کہ اگر شہزادہ زور سے سانس بھی لیتا تو شاہی طبیب کو بلوا کر اس کا معائنہ کراتے تھے کہ کہیں وہ بیمار تو نہیں ہو گیا۔ ایسی حالت میں غریب اُستاد مولا بخش سے کام لینے کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

دن اسی طرح گزر رہے تھے اور ضدی شہزادے کو تعلیم دینے کا کوئی انتظام نہ ہو رہا تھا۔ اس بات کا بادشاہ اور ملکہ کو تو رنج تھا ہی، ملک کے سمجھ دار لوگ بھی سخت پریشان تھے۔ یہ سوچ سوچ کر وہ بہت فکر مند ہوتے تھے کہ بادشاہ کے بعد یہی شہزادہ اس کی جگہ تخت پر بیٹھے گا اور اگر یہ ایسا ہی جاہل اور مغرور رہا تو غریب رعایا تباہ ہو جائے گی۔ یہ لوگ ان باتوں پر غور کرتے تھے اور پریشان ہوتے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں لیکن وہ جو کسی نے کہا

ہے کہ خدا چاہے تو بڑی سے بڑی مشکل دُور ہو جاتی ہے، اتفاق ایسا ہوا کہ حجاز کا رہنے والا ایک عالم ملکوں کی سیر کرتا کرتا ملک شام میں آ گیا اور اسے جو بادشاہ اور رعایا کی پریشانی کا حال معلوم ہوا تو ایک دن بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر کہا: ''بادشاہ سلامت، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں شہزادے صاحب کے دل سے غرور اور ضد نکال سکتا ہوں۔''

''اگر آپ اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو ہم آپ کو اتنی دولت دیں گے کہ آپ کی سات پشتیں عزت اور آرام سے زندگی گزاریں گی۔'' بادشاہ نے خوش ہو کر کہا۔

''عالی جاہ! میں نے یہ کام کرنے کا ارادہ مال و دولت کے لالچ میں نہیں کیا، بلکہ ثواب کے خیال سے کیا ہے۔ اس لیے آپ سے ایک شرط منوانے کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں مانگوں گا۔'' عالم نے کہا۔

''اگر کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس پر عمل کرنا ہمارے لیے مشکل ہو تو ہم آپ کی شرط مان لیں گے۔'' بادشاہ نے کہا۔

''حضور والا! اصل بات یہ ہے کہ شہزادے صاحب کے ایسا بن جانے کی وجہ حضور اور ملکہ عالیہ کی محبت بھی ہے۔ اگر حضور شہزادے صاحب کو شروع زندگی ہی سے یہ بات سمجھا دیتے کہ پیار کے قابل صرف وہ بچے ہوتے ہیں جو ضدی اور گستاخ نہ ہوں، اور بُرے بچوں کو سزا دی جاتی ہے، چاہے وہ شہزادے ہی کیوں نہ ہوں تو شہزادے کی یہ حالت نہ ہوتی۔ بہر حال جو وقت گزر گیا، اس پر پچھتانا فضول ہے۔ اب میں یہ چاہتا ہوں کہ میں شہزادے صاحب کو نیکی کے راستے کی طرف لانے کے لیے جو کوشش کروں، حضور یا ملکہ عالیہ کی طرف سے اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔'' عالم نے کہا۔ ''ہمیں آپ کی یہ شرط منظور ہے۔'' بادشاہ نے کہا۔ پھر اس نے اپنے وزیر کو حکم دیا: ''اس نیک دل انسان کے رہنے کے لیے اچھے مکان اور دوسری ضرورتیں پوری کرنے کا انتظام کر دیا جائے۔''

حجازی عالم نے اپنا ایک چھوٹا سا اسکول اپنے مکان کے ایک حصے ہی میں قائم کیا۔ اس کے اسکول میں بادشاہ کے وزیروں اور امیروں کے بچے پڑھتے تھے اور ان میں سے کئی بچے شہزادے کے دوست تھے۔ حجازی عالم نے اپنے شاگردوں کو کتابوں کا سبق پڑھانے کے علاوہ گھوڑے کی سواری، تلوار چلانا، کشتی لڑنا، لمبی دوڑ اور دوسرے کھیل سکھانے کا بھی انتظام کیا تھا۔ شہزادے سے اس نے بات ہی نہ کی اور نہ اسے یہ معلوم ہونے دیا کہ اس کے شاگرد کیسے عمدہ ہنر سیکھ رہے ہیں۔

دو تین مہینے اسی طرح گزر گئے اور جب حجازی عالم کے شاگرد کھیلوں اور لکھنے پڑھنے میں کافی ہوشیار ہو گئے تو اس نے ایک دن ان سے کہا: ''بچو! ہمارا دل چاہتا ہے کسی دن تم سب کو ساتھ لے کر شکار کے لیے جائیں۔ ہم نے تمہارے والدین سے اس کی اجازت بھی لے لی ہے لیکن کیا ہی اچھا ہو کہ تم شہزادے صاحب کو بھی ساتھ لے جانے کی کوشش کرو۔ اگر تم ان سے شکار کا ذکر کرو گے تو امید ہے وہ ضرور راضی ہو جائیں گے کیوں کہ وہ کھیل تماشوں کے بہت شوقین ہیں۔''

حجازی عالم کا اندازہ درست تھا۔ شکار کی بات سنتے ہی شہزادہ ان کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا اور پروگرام کے مطابق ننھے شکاریوں کی یہ ٹولی جنگل کی طرف روانہ ہو گئی۔ تمام بچوں میں شہزادے کا گھوڑا سب سے زیادہ شان دار تھا۔ اس کا لباس اور ہتھیار بھی سب سے اچھے تھے۔ تلوار تو ایسی تھی کہ کیا کہنا۔ دستہ خالص سونے کا تھا جس پر ہیرے اور لعل جڑے ہوئے تھے لیکن تلوار چلانے اور تیر کا نشانہ لگانے میں وہ ایسا نکما تھا کہ پورے ملک میں شاید ہی کوئی بچہ اس سے زیادہ نالائق ہوگا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے یہ ہنر سیکھا ہی نہ تھا۔

خیر صاحب، تو جب یہ ننھے شکاری جنگل میں پہنچ گئے اور ناشتا کرنے کے بعد کچھ دیر آرام کر چکے تو حجازی عالم نے ان سے کہا: ''بچو! یہ بات غور سے سن لو کہ یہاں تم سب کی حیثیت برابر ہے۔ یہاں نہ کوئی وزیر زادہ ہے نہ شہزادہ۔ تم سب ایک دوسرے کے دوست اور بھائی ہو۔''

''واہ! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہم شہزادے ہیں اور یہ سب ہمارے نوکر ہیں۔'' شہزادے نے بگڑ کر کہا۔

''ہو نہیں سکتا، بلکہ ایسا ہی ہے۔ یاد رکھو! اگر تم نے چیں پٹاخ کی تو ہم تمہیں کھیلوں میں حصہ لینے سے روک دیں گے۔ ہم تمہارے اُستاد ہیں اور وہی ہو گا جو ہم کہیں گے۔ حضور بادشاہ سلامت نے یہ اختیار دے کر ہمیں یہاں بھیجا ہے بلکہ یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر کوئی بچہ حکم نہ مانے تو اسے سخت سزا دیں۔'' حجازی

اُستاد نے سخت آواز میں کہا۔

شہزادے نے غصے بھری نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کوئی سپاہی نظر آئے تو اُستاد کو اس گستاخی کی سزا دینے کے لیے کہے۔

اُستاد نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا: ''اچھا تو بچو! دوسری بات یہ ہے کہ تمھیں کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں ملے گا۔ تم جو شکار مارو گے ہم اس کے پکوانے کا انتظام کر دیں گے اور تم سب اپنا اپنا مارا ہوا شکار کھاؤ گے۔ تو اب شکار کے لیے روانہ ہو جاؤ۔ خدا تمھارا حافظ و نگہبان ہو اور ہاں یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لو کہ کوئی بچہ ایک سے زیادہ جانور کو نشانہ نہ بنائے۔ جو بچہ ایک شکار مارنے میں کامیاب ہو جائے، ڈیرے پر آ جائے۔'' سب بچوں نے یہ بات مان لی اور شکار کے لیے روانہ ہو گئے۔

شہزادے کے سوا سب بچے گھڑ سواری اور تیر چلانے کی خوب مشق کر چکے تھے۔ اس لیے انھوں نے تھوڑی دیر ہی میں کوئی نہ کوئی جانور شکار کر لیا۔ بس شہزادہ خالی ہاتھ رہا۔ اگرچہ بادشاہ نے اسے گھڑ سواری سکھانے اور تیر چلانے کے گُر سکھانے کے واسطے ملک کے بہترین اُستاد مقرر کیے تھے، لیکن اس نے تاش اور شطرنج کھیلنے کے سوا کچھ سیکھا ہی نہ تھا۔ ان کھیلوں سے دل بھرتا تو گپ شپ اور شیخی بھری باتیں کرنے میں وقت برباد کر دیتا تھا۔

اگر شہزادہ اپنے محل میں ہوتا تو اپنے دوستوں کو سزا دلوا کر اپنی شرمندگی چھپاتا لیکن وہ شہر سے بہت دُور جنگل میں تھا اور حجازی اُستاد نے اسے بتا دیا تھا کہ یہاں انصاف کے خلاف کچھ نہ ہو گا اور انصاف یہی تھا کہ شہزادہ بھوکا رہتا کیوں کہ وہ شکار سے خالی ہاتھ لوٹا تھا۔

حجازی اُستاد کو پہلے سے اندازہ تھا کہ مغرور شہزادہ خالی ہاتھ لوٹے گا۔ اس نے ان باتوں کا اندازہ کر کے ہی شکار کا پروگرام بنایا تھا لیکن وہ شہزادے کو بھوکا رکھنا نہیں چاہتا تھا بلکہ صرف یہ سبق دینا چاہتا تھا کہ انسان کو سچی کامیابی اور سچی عزت اسی وقت ملتی ہے جب اس نے خوب محنت کر کے علم حاصل کیا ہو اور اچھی عادتیں اختیار کی ہوں۔ چناں چہ اس نے شہزادے کو شرمندہ نہیں کیا بلکہ پیار بھری آواز میں کہا: ''بیٹے ہمارا خیال ہے اب یہ بات تمھاری سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ صرف شہزادہ ہونا یا کسی امیر آدمی کا بیٹا ہونا ہی کافی نہیں بلکہ علم حاصل کرنا اور ہنر سیکھنا بھی ضروری ہے۔ انسان کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب نوکر چاکر کام نہیں آتے بلکہ ذاتی قابلیت سے بگڑے کام بنتے ہیں۔ آج تم صرف اس وجہ سے ناکام رہے ہو کہ تم نے شہزادگی کے غرور میں نہ گھوڑے کی سواری سیکھی، نہ تیر اور تلوار چلانے میں کمال حاصل کیا۔ بہرحال جو ہوا سو ہوا۔ ہمیں امید ہے اب تم شوق سے علم حاصل کرو گے اور اچھے اچھے ہنر بھی سیکھو گے۔ آؤ وضو کر کے ہمارے ساتھ عصر کی نماز پڑھو پھر ہم تمھارے کھانے کا انتظام کریں گے۔''

شہزادہ اپنے اُستاد کی یہ باتیں سن کر بہت شرمندہ ہوا لیکن ابھی اس کی کچھ اکڑ باقی تھی۔ اس نے اپنی آواز کو رُعب دار بناتے ہوئے کہا: ''لیکن جناب! ہم آپ کے ان لڑکوں کے ساتھ نماز کس طرح پڑھ سکتے ہیں؟ ہمارا جی چاہے گا تو الگ نماز پڑھ لیں گے۔ ہم کوئی معمولی لڑکے نہیں ہیں۔''

حجازی اُستاد نے بہت پیار سے اسے اپنے پاس بٹھایا اور سمجھاتے ہوئے کہا: ''بیٹے! کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ شہزادوں کی نماز اور ہوتی ہے، عام لوگوں کی اور؟''

''جی، ہونی تو چاہیے۔'' شہزادہ غرور بھری آواز میں بولا۔

''لیکن ایسا نہیں ہے۔ بادشاہ اور معمولی کسان ایک ہی نماز پڑھتے ہیں اور اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ پاک نے سب انسانوں کو ایک جیسا درجہ دیا ہے۔ کسی کا بادشاہ یا کسان ہونا تو صرف دُنیا کا انتظام چلانے کے لیے ہے۔'' حجازی اُستاد نے شہزادے کو سمجھایا۔

''آپ کا مطلب ہے ہمارے ابا حضور بھی اسی طرح نماز پڑھتے ہیں جس طرح ان کے خادم پڑھتے ہیں؟'' شہزادے نے سوال کیا۔

''بالکل اسی طرح پڑھتے ہیں۔ تم خود ان سے پوچھ لینا۔''

ہمارا خیال ہے، کہانی پڑھنے والے بچے یہ بات سمجھ گئے ہوں گے کہ بادشاہ نے حجازی اُستاد ہی کی بات کو ٹھیک بنایا اور شہزادے کو یہ بات ماننی پڑی کہ اللہ نے سب انسانوں کو ایک جیسا رتبہ دیا ہے۔ اب بتانے کے قابل صرف یہ بات ہے کہ جب یہ بات شہزادے کی سمجھ میں آ گئی تو وہ ایک اچھا بچہ بن گیا اور بادشاہ نے اس خوشی میں حجازی اُستاد کو مالا مال کر دیا۔

مدیر تعلیم و تربیت! السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟

آج میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ پلیز! اسے ضرور شائع کیجیے گا۔ تعلیم و تربیت بہت عمدہ میگزین ہے۔ میں پچھلے سات سالوں سے یہ پڑھ رہی ہوں۔ میں دو تحریریں بھیج رہی ہوں، اگر قابل اشاعت ہو تو ضرور مطلع کیجیے گا۔ ان تحریروں میں کوئی خامی یا کسر رہ گئی ہے تو میری رہنمائی فرمایئے گا۔ مجھے کہانیاں اور خاص طور پر مضمون لکھنے کا بہت شوق ہے۔ مجھے آپ کی رہنمائی کی اشد ضرورت ہے۔ پلیز، میری رہنمائی فرمایئے گا۔ ''اصلی تماشا'' تحریر میں نے کسی سے آئیڈیا لے کر تحریر کی ہے۔ وہ ''آپ بھی لکھیے'' سلسلے کے لیے نہیں ہے مگر ''گلاب کہانی'' اسی سلسلے کے لیے تحریر کی ہے۔ اللہ تعالیٰ تعلیم و تربیت کو دن دگنی، رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین! (ہادیہ ایمن، جہلم)

☆ گلاب کہانی آپ بھی لکھیے میں شامل کر لی گئی ہے۔ دوسری کہانی اصلی تماشا ناقابلِ اشاعت ہے۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ ہر ماہ کی طرح نومبر کا رسالہ بھی بہت عمدہ تھا۔ تمام کہانیاں قابلِ تعریف تھیں، خاص طور پر پہاڑ اور گلہری۔ آپ سے ایک فرمائش کرنا چاہتی ہوں کہ آپ تمام کہانیوں کے ساتھ ساتھ ایک ڈراؤنی کہانی بھی شائع کیا کریں۔ میں نے پہلے بھی خط بھیجا تھا مگر آپ نے شائع نہیں کیا۔ امید ہے کہ آپ میرا یہ خط ضرور شائع کریں گے۔ میں نے اپنے خط کے ساتھ پہیلیاں بھی بھیجی ہیں۔ اللہ آپ کو دن دگنی اور رات چگنی ترقی دے۔ آمین! (انعم راشد، لاہور)

☆ آپ کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

میری طرف سے تعلیم و تربیت کے تمام اسٹاف کو السلام علیکم! نومبر کے شمارے میں میرا خط شائع ہوا تو مجھے بہت خوشی اور حوصلہ افزائی ہوئی۔ اب میں تعلیم و تربیت کی مستقل قاریہ بن گئی ہوں۔ نومبر کا شمارہ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ کی طرح میں اس سے لطف اندوز ہوئی۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ محاورہ کہانی ہمیشہ کی طرح ٹاپ پر رہی۔ سونے کا مور، پہاڑ اور گلہری اور بدگمانی تینوں کہانیاں بہت پسند آئیں۔ لطیفے بہت اچھے تھے۔ پرواز میں کوتاہی بہت ہی منفرد کہانی تھی۔ امید ہے میرا خط ضرور شائع ہوگا۔ (افراح سجاد، راول پنڈی)

السلام علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ مجھے ساری کہانیاں پسند آئیں لیکن سب سے اچھی کہانیاں تین ہیں جن کے نام سونے کا مور، بدگمانی اور پہاڑ اور گلہری ہیں۔ امید ہے کہ میرا خط ضرور شائع ہوگا۔ (محمد ملک، راول پنڈی)

السلام علیکم ایڈیٹر آپی! کیسی ہیں آپ؟ اللہ پاک آپ اور آپ کی ٹیم کو اپنی امان میں رکھے تاکہ آپ لوگ احسن طریقے سے بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکیں۔ پہلی مرتبہ اس پیاری سی محفل میں شرکت کر رہی ہوں۔ مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے۔ پہلی مرتبہ کوئی تحریر ارسال کر رہی ہوں۔ غیر معیاری ہوئی تو کوئی بات نہیں کیوں کہ مسلسل کوشش و محنت کرنے سے ہی لکھنا آئے گا۔ سارا شمارہ بہت اچھا ہے۔ آپ سے درخواست ہے کہ ہر ماہ شکاریات و نظریۂ پاکستان کے موضوع پر بھی شمارے میں مواد شامل کریں۔ اللہ ہم سب کو آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین! (نوریہ مدثر، سیال کوٹ)

☆ تعریف اور حوصلہ افزائی کا شکریہ۔

ڈیئر ایڈیٹر صاحبہ! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گی۔ آپ کا رسالہ بہت اچھا ہے۔ ساری کہانیاں لاجواب ہیں۔ پلیز، میرے خط کو ضرور شائع کریں۔ میں نے پہلے بھی لکھا تھا لیکن آپ نے شائع نہیں کیا۔ نسیم حجازی کے تاریخی ناول جاری کریں۔ (عرشیہ مرجان، اسلام آباد)

ایڈیٹر صاحبہ! میری طرف سے آپ کو اور تعلیم و تربیت کی ساری ٹیم کو السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں تین سال سے تعلیم و تربیت کو باقاعدگی سے پڑھ رہی ہوں۔ میرے گھر میں سب اسے شوق سے پڑھتے ہیں۔ تمام سلسلے زبردست ہیں۔ مجھے امید ہے کہ میرا خط ضرور پڑھا جائے گا۔ یہ ردی کی ٹوکری میں پھینکا نہیں جائے گا کیوں کہ میں اس کی ہر کہانی شوق سے پڑھتی ہوں اور میں نے اس کا ہر شمارہ سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ برائے مہربانی میرا خط ضرور شائع کیجیے گا۔ بہت شکریہ! (فاطمہ ہاشم، لاہور)

السلام علیکم! میں امید کرتی ہوں آپ سب بخیریت ہوں گے۔ میں بہت عرصہ بعد شرکت کر رہی ہوں۔ کیا آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی؟ رسالہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ 8 دسمبر کو میری دوست عائشہ کی اور 5 دسمبر کو میری ٹیچر مس روبینہ کی سال گرہ ہے۔ پلیز میری اور اپنی طرف سے انہیں مبارک باد دے دیں۔ یہ خط ضرور شائع کیجیے گا، میری ٹیچر کو بہت خوشی ہوگی کہ انہیں آپ سال گرہ کی مبارک باد دے رہی ہیں۔ آپ سب کے لیے ڈھیر ساری دعائیں۔ (ماہ رخ ناصر، سرگودھا)

☆ **آپ سب کو سال گرہ مبارک ہو۔ ہم ہمیشہ تمام بچوں کو یاد رکھتے ہیں۔**

میری طرف سے آپ کی پوری ٹیم کو السلام علیکم! امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ میں دو سال سے تعلیم و تربیت کی خاموش قاریہ ہوں۔ نومبر کا رسالہ اپنے عروج پر تھا۔ کہانیوں میں نیا زمانہ نیا دور، سونے کا مور اور پہاڑ اور گلہری بے حد پسند آئی۔ امید کرتی ہوں کہ آپ میرا خط ردی کی ٹوکری کی نذر نہیں کریں گے، ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا۔ آخر میں دعا کرتی ہوں کہ یہ رسالہ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔ آمین! (نمرہ ناز، راول پنڈی)

آپ سب سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ کا نومبر کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ مجھے شہیدِ کربلا...... سیدنا حسینؓ ابن علی اور پیغامِ کربلا بہت پسند آیا۔ امید ہے کہ میرا خط ردی کی ٹوکری کی زینت نہیں بنے گا۔ میں نے آپ کا شمارہ پہلی بار پڑھا اور امید ہے کہ آگے بھی پڑھوں گی۔ مجھے آپ کا ذائقہ کارنر بھی بہت پسند آیا اور انشاء اللہ میں دونوں چیزیں بناؤں گی۔ مجھے آپ کی کہانیوں میں سے الزام تراشی بہت پسند آئی تھی۔ آپ کا شمارہ بہت سبق آموز تھا۔ (آمنہ ظفر، ملتان)

السلام علیکم! ایڈیٹر صاحبہ، کیا حال ہے؟ امید ہے آپ سب خیریت سے ہوں گے۔ نومبر کا شمارہ ٹاپ پر تھا۔ اقبال اور عشق رسولؐ، کر بھلا، ہو بھلا اور حسد کی آگ اچھی لگی۔ آپ سے گزارش ہے کہ کوئی قسط وار کہانی اسٹارٹ کریں۔ میں چار سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہا ہوں۔ میں اس بار بہت کچھ بھیج رہا ہوں، ضرور شائع کریں۔

(محمد عون عبداللہ، واہ کینٹ)

مدیرہ تعلیم و تربیت، السلام علیکم! میں چھٹی جماعت کی طالبہ ہوں۔ بھائی جان حافظِ قرآن ہیں۔ امتحان میں کام یابی کے انعام میں بھائی جان نے میرے لیے تعلیم و تربیت کا رسالہ ہر مہینے لا کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ تین ماہ سے وعدے کو نبھا رہے ہیں۔ میں ہر مہینے خط لکھتی ہوں مگر ردی کی ٹوکری میں جاتا ہے۔ بھائی جان اور مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ ابو جان بتاتے ہیں کہ تعلیم و تربیت کا رسالہ چھوڑنے کا بہت نقصان ہے۔ ''کھوج لگائیے'' کے سلسلے میں انعام بھی حاصل کیا تھا۔ نومبر کے تعلیم و تربیت نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ میرا دھیان اپنی طرف کھینچ لیا ہے۔ میرے علم میں اضافے کا یہی سبب ہے۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول اور حسد کی آگ ہم میں اصلاح کا ذریعہ بنتے ہیں۔ میں خوب محنت کر رہی ہوں، امتحان قریب ہیں مگر بیمار ہوں۔ ستمبر کو سال گرہ تھی اور رزلٹ تھا۔ میں اعلیٰ نمبروں سے پاس ہوگئی ہوں۔ میں آگے بھی محنت کرنا چاہتی ہوں مگر بیماری نے مجھے مجبور کیا ہے۔ میں آپ سے دعاؤں کی طلب گار ہوں۔ امی جان نے بتایا کہ کام یابی کے لیے تین چیزیں بہت ضروری ہیں۔ محنت، ماں باپ کی اور اساتذہ کرام کی دعائیں۔ میں نے لگاتار محنت سے دو چیزیں حاصل کر لی ہیں۔ تعلیم و تربیت نے میرے علم میں اضافہ کیا ہے اور اس کے لکھنے والے آپ ہیں۔ آپ میرے بہترین اساتذہ ہیں۔ میں آپ کی دعائیں چاہتی ہوں۔ (فاطمۃ الزہرہ، لاہور)

☆ **اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و تندرستی عطا فرمائے۔ آمین!**

تعلیم و تربیت وہ باغ ہے جو ہر قسم کے پودوں، پھلوں، پھولوں اور شجروں سے بھرا ہوا ہے اور ہر وقت پرندوں کے چہچہانے سے چہکتا رہتا ہے۔ اس میں تمام حکایتیں زبردست ہیں۔ تعلیم و تربیت کے نئے سلسلے قابلِ تعریف ہیں۔ اللہ آپ کو ترقی دے۔ آدھی ملاقات قبول فرمائیں اور اس کو رد نہ کریں۔ شکریہ! (اسامہ ظفر راجہ، جہلم)

☆ **اتنا خوب صورت اور محبت بھرا خط لکھنے کا شکریہ!**

ان ساتھیوں کے خطوط بھی بڑے مثبت اور اچھے تھے، تاہم جگہ کی کمی کے باعث ان کے نام شائع کیے جا رہے ہیں:

عمر رضا، سعادت پور۔ مریم راجہ، راول پنڈی۔ وردہ زہرہ، جھنگ صدر۔ رانا بلال احمد، بھکر۔ حافظ حسان طاہر، غلام فرید، پاک پتن شریف۔ مناہل افضل، لاہور۔ ایمن کائنات، ڈیرہ غازی خان۔ علینہ احمد، راول پنڈی۔ صباحت فاطمہ، میاں والی۔ عشاء نور، سیال کوٹ۔ عروہ خان، شرقپور۔ عبداللہ شعیب، لاہور۔ زینب ناصر، فیصل آباد۔ محمد حسنات، راول پنڈی۔ کرن فاروق، احد غفران، ثمرہ طارق بٹ، کرن فاروق بٹ، آروپ، گوجرانوالہ۔ محمد شکیب۔ خدیجہ شفیق، احمد یار، سید محمد علی حسن، عماد احمد، محمد افضل انصاری، عبدالجبار رومی انصاری، لاہور۔ زینب محمود، جہلم۔ انعم محمد حنیف، کراچی۔ ایقہ احسان، سیال کوٹ۔ محمد حسنین معاویہ، ڈیرہ اسماعیل خان۔

مٹن کھڑا مصالحہ

اجزاء:

بکرے کا گوشت (چکور ٹکڑے):	ایک کلو	گرم مصالحہ:	آدھا چائے کا چمچ	تیل:	آدھا کپ
خشک دھنیے کا پاؤڈر:	دو چائے کے چمچ	تیز پات:	تین عدد	زیرے کا پاؤڈر:	1-1/3 چائے کا چمچ
مونگ:	دس عدد	نمک:	حسب ذائقہ	دار چینی:	پانچ عدد
جاوتری کا پاؤڈر:	2/3 چائے کا چمچ	سرخ مرچ (ثابت):	آٹھ عدد	جائفل کا پاؤڈر:	آدھا چمچ
چھوٹی الائچی:	دس عدد	کالی مرچ (پسی ہوئی):	دو چائے کے چمچ	پیاز (کٹی ہوئی):	ایک کپ
ہری مرچ (ثابت):	بارہ عدد	ادرک کا پیسٹ:	چار کھانے کے چمچ	پودینہ (کترا ہوا):	1-2/3 چائے کا چمچ
لہسن کا پیسٹ:	چار کھانے کے چمچ	دہی:	ایک کپ		

ترکیب: ثابت مصالحوں کو درمیانی آنچ پر تیل میں کڑکڑا لیں۔ پھر پیاز حل کر سنہری کر لیں اور ادرک لہسن کا پیسٹ ڈال کر 5 منٹ تک مزید پکائیں اور پھر ہلکی آنچ پر گوشت کو گلنے دیں۔ اس پر گرم مصالحے، دھنیے، زیرے، جاوتری اور کالی مرچ کا پاؤڈر بمعہ نمک چھڑک دیں اور ثابت ہری مرچیں ڈال دیں۔ دو یا تین منٹ دم لگانے کے بعد ہرے دھنیے اور تازہ پودینے سے سجا کر پیش کریں۔

چکن منچورین

اجزاء:

چکن (بون لیس):	آدھا کلو	پیاز (پسی ہوئی):	ایک عدد	ٹماٹو سوس:	آدھی پیالی
پائن ایپل (جوس):	آدھی پیالی	نمک:	حسب ذائقہ	سفید مرچ:	ایک چائے کا چمچ
سفید سرکہ:	دو کھانے کے چمچ	ادرک، لہسن (پیسٹ):	ایک کھانے کا چمچ	چینی:	ایک چائے کا چمچ
پائن ایپل کیوبز:	آدھا کپ	سویا سوس:	دو کھانے کے چمچ	کارن فلور:	دو کھانے کے چمچ
چکن کیوب ملا میدہ:	ایک کھانے کا چمچ	آئل:	دو کھانے کے چمچ		

ترکیب: چکن میں نمک، چینی، سرکہ، سویا سوس اور ایک چمچ کارن فلور ملا کر ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں اور سبز امرائی میں سبزیوں کو ہلکا سا گلابی کر لیں۔ زیادہ پکاتے نہیں۔ ایک پین میں تیل گرم کر کے ادرک لہسن پیسٹ اور پیاز ڈال کر ہلکی بھون لیں۔ اب ٹماٹو ساس، سفید مرچ اور پائن ایپل جوس ڈال کر سوس بنا لیں۔ چکن ڈال کر تھوڑا سا بھون لیں اور پائن ایپل کیوبز اور کارن فلور پانی میں گھول کر ڈال دیں۔ ساتھ ہی میدہ ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔ چکن منچورین تیار ہے۔

سطح سمندر سے 706 فٹ بلندی پر واقع لاہور (Lahore) صوبہ پنجاب کا دارالحکومت اور پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ پاکستان کا ثقافتی، تعلیمی اور تاریخی مرکز ہے۔ اسے پاکستان کا دل بھی کہتے ہیں۔ یہ شہر دریائے راوی کے کنارے واقع ہے۔ اس شہر کی آبادی ایک کروڑ کے قریب ہے۔ شاہی قلعہ، شالامار باغ، بادشاہی مسجد، مقبرہ جہانگیر اور مقبرہ نور جہاں مغلیہ دور کی یادگار ہیں۔ سکھ اور برطانوی دور کی تاریخی عمارات بھی موجود ہیں۔

لاہور کے بارے میں سب سے پہلے چین کے باشندے ہیون سانگ (Heaven Sang) نے لکھا جو ہندوستان جاتے ہوئے لاہور سے 630 عیسوی میں گزرا۔ اس شہر کی ابتدائی تاریخ کے بارے میں مشہور ہے کہ رام چندر جی کے بیٹے ''لوہو'' نے یہ بستی آباد کی تھی لیکن اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ قدیم ہندو پرانوں (ہندوؤں کی مذہبی کتابیں) میں لاہور کا نام ''لوہ پور'' یعنی لوہ کا شہر ملتا ہے۔ راجپوت دستاویزات میں اسے ''لوہ کوٹ'' یعنی لوہ کا قلعہ کے نام سے پکارا گیا ہے۔ نویں صدی عیسوی کے مشہور سیاح ''الادریسی'' نے اسے ''لہاور'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ قدیم حوالہ جات اس بات کے غماز ہیں کہ اوائل تاریخ سے ہی یہ شہر اہمیت کا حامل تھا۔ درحقیقت ایک ایسے راستے پر جو صدیوں سے بیرونی حملہ آوروں کی رہ گزر رہا ہے، اس کا دریا کے کنارے واقع ہونا اس کی اہمیت کا ضامن رہا ہے۔ ''فتح البلادن'' میں 664ء کے واقعات میں بھی لاہور کا ذکر ملتا ہے۔

ساتویں صدی عیسوی کے اواخر میں لاہور ایک راجپوت چوہان بادشاہ کا پایۂ تخت تھا۔ 682ء میں کرمان اور پشاور کے مسلم پٹھان قبائل راجہ پر حملہ آور ہوئے۔ پانچ ماہ تک لڑائی جاری رہی اور بالآخر سالٹ رینج کے گکھڑ راجپوتوں کے تعاون سے وہ راجہ سے اس کے کچھ علاقے چھیننے میں کام یاب ہو گئے۔ نویں صدی عیسوی میں لاہور کے ہندو راجپوت چتوڑ کے دفاع کے لیے مقامی فوجوں کی مدد کو پہنچے۔ دسویں صدی عیسوی میں خراسان کا صوبہ دار سبکتگین اس پر حملہ آور ہوا۔ لاہور کا راجہ جے پال جس کی سلطنت سرہند سے لمگھان تک اور کشمیر سے ملتان تک وسیع تھی، مقابلہ کے لئے آیا۔ ایک بھٹی راجہ کے مشورے پر راجہ جے پال نے پٹھانوں کے ساتھ اتحاد کر لیا اور اس طرح وہ حملہ آور فوج کو شکست دینے میں کام یاب رہا۔ غزنی کے تخت پر قابض ہونے کے بعد سبکتگین ایک دفعہ پھر حملہ آور ہوا۔ لمگھان کے قریب گھمسان کا رن پڑا اور راجہ جے پال مغلوب ہو کر امن کا طالب ہوا۔ طے یہ پایا کہ راجہ جے پال تاوانِ جنگ کی ادائیگی کرے گا اور سلطان نے اس مقصد کے

لیے ہرکارے راجہ کے ساتھ بھیج دیے۔ لاہور پہنچ کر راجہ معاہدے سے مکر گیا اور سبکتگین کے ہرکاروں کو قید کر دیا۔ اس اطلاع پر سلطان غیض و غضب میں دوبارہ لاہور پر حملہ آور ہوا۔ ایک دفعہ پھر میدانِ کارزار گرم ہوا۔ جے پال کو شکست ہوئی اور دریائے سندھ سے پرے کا علاقہ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسری دفعہ مسلسل شکست پر دلبرداشتہ ہوکر راجہ جے پال نے لاہور کے باہر خودسوزی کر لی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کا مقصد صرف راجہ کو سبق سکھانا تھا کیوں کہ اس نے مفتوحہ علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل نہیں کیا اور 1008ء میں جب سبکتگین کا بیٹا محمود ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو جے پال کا بیٹا آنند پال ایک لشکرِ جرار لے کر پشاور کے قریب مقابلہ کے لیے آیا۔ محمود کی فوج نے آتش گیر مادے سے گولہ باری کی جس سے آنند پال کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی اور ان کی ہمت ٹوٹ گئی۔ نتیجتاً کچھ فوج بھاگ نکلی اور باقی کام آئی۔ اس شکست کے باوجود لاہور بدستور محفوظ رہا۔ آنند پال کے بعد اس کا بیٹا جے پال تخت نشین ہوا اور لاہور پر اس خاندان کی عمل داری 1022ء تک برقرار رہی، حتیٰ کہ محمود اچانک کشمیر سے ہوتا ہوا لاہور پر حملہ آور ہوا۔ جے پال اور اس کا خاندان اجمیر پناہ گزین ہوا۔ اس شکست کے بعد لاہور غزنوی سلطنت کا حصہ بنا اور پھر کبھی بھی کسی ہندو سلطنت کا حصہ نہیں رہا۔ محمود کے پوتے مودود کے عہدِ حکومت میں راجپوتوں نے شہر کو واپس لینے کے لیے چڑھائی کی مگر چھ ماہ کے محاصرے کے بعد ناکام واپس ہوئے۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد محمود غزنوی نے اپنے پسندیدہ غلام ملک ایاز کو لاہور کا گورنر مقرر کیا جو سلطان محمود غزنوی کا منظورِ نظر تھا اور جس نے شہر کے گرد دیوار قائم کرنے کے ساتھ ساتھ قلعہ لاہور کی بھی بنیاد رکھی۔ ملک ایاز کا مزار آج بھی چوک رنگ محل لاہور کے پہلے مسلمان حکمران کے مزار کے طور پر جانا جاتا ہے۔ غزنوی حکمرانوں کے ابتدائی آٹھ حکمرانوں کے دور میں لاہور کا انتظام صوبہ داروں کے ذریعہ چلایا جاتا تھا، تاہم مسعود ثانی کے دور میں (1098ء-1114ء) دارالحکومت عارضی طور پر لاہور منتقل کر دیا گیا۔

اس کے بعد غزنوی خاندان کے بارہویں تاجدار خسرو کے دور میں لاہور ایک دفعہ پھر پایۂ تخت بنا دیا گیا اور اس کی یہ حیثیت 1186ء میں غزنوی خاندان کے زوال تک برقرار رہی۔ لاہور 1186ء سے 1290ء تک سلاطین غوری کے زیرِنگیں رہا۔ ان میں سلطان قطب الدین ایبک کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کا مزار انارکلی کے قریب ایبک روڈ پر واقع ہے۔ غزنوی خاندان کے زوال کے بعد غوری خاندان اور خاندانِ غلاماں کے دور میں لاہور سلطنت کے خلاف سازشوں کا مرکز رہا۔ شہاب الدین غوری خاندان کے جن بارہ افراد نے حکومت کی، ان میں قطب الدین ایبک، آرام شاہ، شمس الدین، رکن الدین، فیروز شاہ، رضیہ سلطان اور بہرام شاہ بھی شامل تھے۔ درحقیقت لاہور ہمیشہ پٹھانوں کے مقابلہ میں مغل حکمرانوں کی حمایت کرتا رہا۔ 1241ء میں چنگیز خان کی فوجوں نے سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد کی فوج کو راوی کے کنارے شکست دی اور حضرت امیر خسرو کو گرفتار کیا۔ اس فتح کے بعد چنگیز خان کی فوج نے لاہور کو تاراج کر دیا۔

خلجی اور تغلق شاہوں کے ادوار میں لاہور کو کوئی قابلِ ذکر اہمیت حاصل نہ تھی اور ایک دفعہ گکھڑ راجپوتوں نے اسے لوٹا۔ 1397ء میں امیر تیمور برصغیر پر حملہ آور ہوا اور اس کے لشکر کی ایک ٹکڑی نے لاہور فتح کیا۔ تاہم اپنے پیشرو کے برعکس امیر تیمور نے لاہور کو تاراج کرنے سے اجتناب کیا اور ایک افغان سردار خضر خان کو لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا۔ اس کے بعد سے لاہور کی حکومت کبھی حکمران خاندان اور کبھی گکھڑ راجپوتوں کے ہاتھ رہی، یہاں تک کہ 1436ء میں بہلول خان لودھی نے اسے فتح کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ بہلول خان لودھی کے پوتے ابراہیم لودھی کے دورِ حکومت میں لاہور کے افغان صوبہ دار دولت خان لودھی نے علمِ بغاوت بلند کیا اور اپنی مدد کے لیے مغل شہزادے بابر کو پکارا۔

بابر پہلے سے ہی ہندوستان پر حملہ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دولت خان لودھی کی دعوت نے اس پر مہمیز کا کام کیا۔ لاہور کے قریب بابر اور ابراہیم لودھی کی فوج میں پہلا ٹکراؤ ہوا جس میں بابر فتح یاب ہوا، تاہم صرف چار روز کے وقفہ کے بعد اس نے دہلی کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ ابھی بابر سرہند کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اسے دولت خان لودھی کی سازش کی اطلاع ملی جس پر وہ اپنا ارادہ منسوخ کر کے لاہور کی جانب بڑھا اور مفتوحہ علاقوں کو اپنے وفادار سرداروں کے زیرِ انتظام کر کے کابل واپس ہوا۔ اگلے برس لاہور میں سازشوں کا بازار گرم ہونے کی اطلاعات ملنے پر بابر دوبارہ عازمِ لاہور ہوا۔ مخالف افواج راوی کے قریب مقابلہ کے لیے سامنے آئیں مگر مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی بھاگ نکلیں۔ لاہور میں داخل ہوئے بغیر بابر دہلی کی طرف بڑھا اور پانی پت کی لڑائی میں فیصلہ کن فتح حاصل کر کے دہلی کے تخت پر قابض ہوا۔ اس طرح ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی ابتداء لاہور کے صوبہ دار کی بابر کو دعوت سے ہوئی۔

مغلوں کے دور (سولہویں سترہویں صدی عیسوی) میں لاہور عروج پر رہا اور کچھ عرصے کے لیے پایۂ تخت بھی رہا۔ عہدِ مغلیہ میں شہنشاہ بابر نے مرزا کامران کو لاہور کا صوبے دار مقرر کیا۔ اس کے دور میں یہاں ایک باغ تعمیر ہوا۔ دریائے راوی کے کنارے کامران کی بارہ دری اسی باغ کا حصہ ہے۔ ہمایوں کے عہد میں لاہور شورشوں کی آماجگاہ بنا رہا۔ اکبر نے تاج پوشی کے فوراً بعد لاہور کے حالات کی اصلاح کی۔ اکبر کے عہد میں شہر لاہور تقریباً از سرِ نو تعمیر ہوا۔ شہر کا قدیم قلعہ اکبر نے دوبارہ پختہ تعمیر کرایا۔ شہر کو پختہ فصیل کے ذریعے محفوظ کرنے اور مختلف سمتوں میں بعض دروازے قائم کرنے کا کام بھی اسی زمانے میں ہوا۔

لاہور کے مشہور دروازے:

1- دہلی دروازہ 2- اکبری دروازہ 3- شاہ عالمی دروازہ
4- لوہاری دروازہ 5- بھاٹی دروازہ 6- ٹکسالی دروازہ
7- روشنائی دروازہ 8- مستی دروازہ 9- کشمیری دروازہ
10- خضری دروازہ 11- ذکی دروازہ المعروف یکی دروازہ
12- شیراں والا دروازہ ☆ موری دروازہ

1773ء میں لہنہ سنگھ لاہور پر قابض ہو گیا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے عہد میں لاہور سکھوں کا زبردست گڑھ تھا۔ 1848ء میں سکھوں کا اقتدار بھی ختم ہو گیا اور انگریزوں نے اس شہر پر قبضہ کر لیا۔

لاہور میں بجلی 1929ء یا 1939ء میں آئی تھی۔ اس زمانے میں راوی دریا اور پنکھے کی ہوا پر اہلِ لاہور گرمیاں گزار دیتے تھے۔ دریائے راوی کی وجہ سے لاہور کی راتیں ٹھنڈی ہوتی تھیں۔ لاہور شہر میں تانگہ چلا کرتا تھا۔ بھینسوں کو بھی شہر میں گھومنے پھرنے کی آزادی تھی۔ اس وجہ سے لاہور کی کافی سڑکیں صاف نہیں رہتی تھیں لیکن مال روڈ ہر روز دوپہر کے وقت دھوئی جاتی تھی۔

لاہور کو کئی تاریخی عمارتوں، مسجدوں، مقبروں اور باغات کی وجہ سے عالمی شہرت حاصل ہے۔ اس شہر میں کئی بزرگوں کے مزارات واقع ہیں جن میں حضرت داتا گنج بخشؒ، حضرت میاں میرؒ، حضرت مادھول لال حسینؒ حضرت شاہ ابوالمعالیؒ، حضرت سید میاں موج دریاؒ شامل ہیں۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبال کا مزار بھی بادشاہی مسجد کے سامنے واقع ہے۔ لاہور کا موجودہ شہر کئی جدید بستیوں اور عمارتوں سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ان میں جوہر ٹاؤن، بحریہ ٹاؤن، ماڈل ٹاؤن، گلبرگ، ڈیفنس، گرین ٹاؤن اور سبزہ زار نمایاں ہیں۔

لاہور شہر کی مشہور جگہوں میں علامہ اقبال انٹرنیشنل ایئر پورٹ، عجائب گھر، پنجاب یونی ورسٹی، باغ جناح، مینارِ پاکستان، شالامار باغ، مال روڈ، انارکلی، فورٹریس اسٹیڈیم اور لبرٹی وغیرہ شامل ہیں۔

اس شہر کی جدیدیت میں اضافہ لاہور میٹرو بس سروس نے کیا ہے جسے حال ہی میں ترکی کے تعاون سے تعمیر کیا گیا ہے۔

☆☆☆

معاذ اور تزئین کے پاس ایک ننھا سا بحری جہاز تھا جس کا بہت ہی خوب صورت سفید رنگ کا بادبان تھا۔ انھوں نے اس کا نام بحری عقاب رکھا ہوا تھا۔ اکثر دونوں بچے اپنے گھر کے نزدیک بہتی ہوئی ندی کے کنارے اسے لے جاتے اور پھر اسے ندی کے پانی میں بہنے کے لیے چھوڑ دیتے اور وہ بہاؤ کے ساتھ تیرتا رہتا۔ کیا مجال جو اس نے کبھی توازن کھویا ہو جو اکثر کھلونے جہاز پانی میں کھو دیتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں مگر بحری عقاب تو ایک نرالی شان سے لہروں پر تیرتا رہتا۔ جیسے وہ سچ مچ اصل بجرہ ہو۔ ایک دن معاذ اور تزئین اسے ندی میں بہا رہے تھے کہ اچانک اس کے ساتھ بندھی ہوئی تار ٹوٹ گئی جس سے جہاز آگے ہی آگے سفر کرنے لگا۔ بچے تیزی سے اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے لیکن اب وہ اسے پکڑ نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ ندی کے بیچوں بیچ تیر رہا تھا۔ کنارے پر بھاگتے بچوں کی راہ میں ایک کانٹوں کی باڑ آ گئی جس کی وجہ سے انہیں رکنا پڑا اور وہ دونوں منہ بسورتے جہاز کے بغیر گھر واپس آ گئے۔ وہ پریشان تھے کہ جہاز کا کیا بنے گا اور وہ صبح ہی سوچ رہے تھے۔

جہاز اب اپنی مرضی کے بغیر آگے بڑھ رہا تھا کیوں کہ اب وہ پانی کے بہاؤ کے خلاف واپس تیر کر نہیں آ سکتا تھا۔ وہ تیرتا رہا، حتیٰ کہ ایک جگہ ندی کے کنارے اُگی ہوئی کائی میں پھنس کر رُک گیا۔ وہ اس طرح پھنسا کہ نہ وہ آگے کی طرف حرکت کر سکتا تھا اور نہ پیچھے کی طرف۔ پھر تھوڑی دیر بعد رات کا اندھیرا چھا گیا۔ تنہا جہاز چمکتے چاند کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ آج تک اس کی ہر رات کھلونوں کی الماری میں گزری تھی اور وہ چمکتے چاند اور ستاروں کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ بس چاند کو دیکھتا رہا اور اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوتا رہا۔ پھر اچانک اس کی توجہ ندی کے دوسرے کنارے کی طرف گئی جہاں بہت سی چھوٹی چھوٹی شمعیں روشن تھیں، جیسے جاپان میں لوگ لالٹین کے میلے پر بتیاں روشن کرتے ہیں۔ اس کے کان میں بہت سی باریک باریک آوازیں بھی پڑیں اور پھر اس کی نظر بہت سی پریوں اور پری زادوں پر پڑی جو بہت خوش نظر آ رہے تھے اور شاید کسی جشن کی تیاری میں تھے۔ ایک ترتیب سے کھمبیوں سے بنے تخت پوش بچھے ہوئے تھے اور ان پر نہایت اُجلے کپڑے اوڑھائے گئے تھے۔ وہ انہیں میزوں کی طرح استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے کھمبیوں سے بنے میزوں پر پلیٹ اور گلاس ترتیب سے رکھے اور کچھ دُور چند سنہری کرسیاں بھی بچھائیں جہاں سازندوں نے بیٹھ کر موسیقی کی دھنیں بکھیرنی تھیں۔ جہاز دم سادھے یہ سارا نظارہ دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ وہی پریاں ہیں جن کی

داستانیں تزئین اور معاذ اکثر ایک دوسرے کو سونے سے پہلے سناتے ہیں۔ پھر اس نے ندی کے کنارے پر اپنے جیسی ایک اور کشتی دیکھی جو اس سے کہیں چھوٹی تھی۔ اس نے دیکھا کہ کچھ پری زاد اس پر سوار ہو رہے ہیں۔ اس نے اپنی جانب کنارے پر بھی پریوں اور پری زادوں کا ایک غول دیکھا جن کے ہاتھوں میں پارٹی کے لیے بڑے مزے مزے کی چیزیں تھیں۔ شہد والے کیک رنگ برنگی جیلی والے بسکٹ گلابی آئس کریم، پینے کے لیے شبنم کے قطروں سے بنے ہوئے شربت اور اسی طرح کی کئی مزے دار چیزیں پلیٹوں اور ٹوکریوں میں ڈال کر لا رہے تھے۔ اب وہ انتظار کر رہے تھے کہ کشتی اس کنارے پر آئے اور انہیں بٹھا کر دوسرے کنارے پر لے جائے تاکہ وہ کھمبی کے میزوں پر یہ چیزیں سجائیں۔ وہ جوش سے چپوار چلاتے پری زادوں کو آوازیں دے رہے تھے لیکن ارے یہ کیا؟ اچانک ندی میں سے ایک بڑی مچھلی نے ہوا میں اُچھل کر ندی میں ڈبکی لگائی جس سے ندی میں ایک پانی کی ایک بڑی لہر پیدا ہوئی۔ پری زادوں کی کشتی میں پانی بھر گیا اور وہ ندی میں اُلٹ گئی۔ کنارے پر کھڑے سب کی چیخیں نکل گئیں۔ سب نے دیکھا کہ پری زاد بھی ندی کے پانی میں ڈبکیاں کھا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر معاذ اور تزئین کے جہاز نے ارادہ کر لیا کہ وہ اس کنارے پر کھڑے پری زادوں اور پریوں کو ان کے کھانے کے سامان سمیت دوسرے کنارے تک لے کر جائے گا۔ اس نے اپنی عجیب و غریب بھیگی بھیگی سی آواز سے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کی آواز سن کر سبھی پریشان ہو گئے۔ ایک پری کے ہاتھ سے تو گھبرا کر جیلی نیچے گھاس پر گر گئی۔ اس نے سب کو تسلی دیتے ہوئے بتایا کہ وہ ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ وہ تو صرف ایک کھلونا جہاز ہے۔

وہ ان کو دوسرے کنارے پر لے جا سکتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی اسے چلانا جانتا ہے، وہ ندی میں کھو گیا ہے تو اسے ان کی مدد کر کے خوشی ہو گی۔ یہ سن کر پری زاد خوشی خوشی جہاز کی طرف آ گئے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے کہ اگر جہاز ان کی مدد نہ کرتا تو جشن کی تقریبات خراب ہو جاتیں جہاں اس میں شرکت کے لیے بادشاہ اور ملکہ بھی آ رہے تھے۔ وہ سب جہاز پر سوار ہو کر آرام سے بیٹھ گئے۔ ایک پری زاد نے جہاز کا اسٹیرنگ سنبھال لیا۔ جہاز انتہائی فخریہ انداز سے ندی میں تیر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس پر صرف گڑیوں اور گڈوں نے سیر کی تھی جو حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ صرف آسمان کی طرف منہ کر کے گھورتے رہتے تھے۔ یہ پریاں اور پری زاد نہ صرف ہنس بول رہے تھے بلکہ جہاز کے عرشے پر ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور جھک کر ندی کے پانی کو انگلیوں سے چھو رہے تھے۔ اب جہاز کے بادبانوں میں ہوا بھر گئی تھی اور وہ ایک راج ہنس کی طرح پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔ دوسرے کنارے پر کھڑی پریاں اُچھل اُچھل کر خوشی سے جہاز کا استقبال کر رہی تھیں اور یہی وہ لمحہ تھا جب بادشاہ سلامت اور ملکہ بھی وہیں تشریف لے آئے۔ وہ بھی جہاز کو باحفاظت اپنی طرف آتا دیکھ کر بہت خوش ہو رہے تھے۔ جب اس نے تمام مسافروں کو بخیریت دوسرے کنارے پر اُتار دیا تو پھر وہ فارغ تھا۔ اس نے

چاند کی روشنی میں ساری رات پریوں کا جشن دیکھا۔ وہ اس طرح رقص کر رہی تھیں جیسے شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں اور جہاز کی مراد بر آئی ہو۔ جب ملکہ اور بادشاہ نے جہاز پر سیر کا پروگرام بنایا تو اس نے سیر کے پروگرام پر خوش ہونے کے ساتھ بادشاہ کو اپنی مجبوری بھی بتائی کہ ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے اور بہاؤ کے خلاف تیرنا اس کے لیے ناممکن ہوگا۔ بادشاہ نے کہا: ”کوئی بات نہیں، میں ایک جادو کے منتر سے تمہاری مدد کر دیتا ہوں۔ پانی کے بہاؤ کا تم پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ جب ہم سیر سے تھک جائیں گے تو ہماری تتلیوں والی بگھی آ جائے گی اور ہم اس پر سوار ہو جائیں گے۔“ یہ کہہ کر بادشاہ سلامت اور ملکہ جہاز پر سوار ہو گئے اور جہاز آسانی سے پانی کے بہاؤ کے مخالف تیرنے لگا۔ چاندنی سے منظر بہت مسحور کن ہو رہا تھا۔ ندی کے کنارے درخت بھی چاندی میں نہائے ہوئے تھے اور ندی کی کرنیں بھی چاندی سے بنی ہوئی لگ رہی تھیں۔ دو چار چمگادڑیں جہاز کے ساتھ ساتھ محو پرواز تھیں۔ پھر اچانک ایک سفید اُلو نے اُڑتے ہوئے ہو ہو کی آواز نکالی۔ کیسا حیرت انگیز سفر تھا۔ پھر جیسے ہی یہ سیر ختم ہوئی، بادشاہ کی بگھی کنارے پر آگئی جسے چار تتلیاں کھینچ رہی تھیں۔ جیسے ہی بادشاہ سلامت بگھی میں بیٹھے، جہاز نے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ تزئین اور معاذ سے علیحدہ ہوا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح یہیں ٹھہر سکے تاکہ صبح تزئین اور معاذ اسے تلاش کر لیں۔ بادشاہ سلامت اس کی خواہش بھانپ گئے اور انہوں نے اسے ندی کے کنارے کھڑے سرکنڈوں سے بندھوا دیا۔ پھر انہوں نے جہاز کے بادبان چاندی کے بنا دیے۔ یہ بادشاہ کی طرف سے جہاز کا انعام تھا۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ کی بگھی تتلیوں نے اُڑا کر ہوا میں بلند کر دی اور آخر وہ چاندنی رات میں جہاز کو نظر آنی بند ہو گئی۔

صبح ہونے والی تھی، جہاز کچھ دیر سستاتا رہا۔ اب وہ انتظار میں تھا کہ بچے آئیں اور اس کا چاندی سے بنا بادبان دیکھیں۔ بچے بھی بے تاب تھے۔ وہ صبح صبح جہاز کی تلاش میں ناشتے کے بغیر ہی بھاگے آ رہے تھے۔ وہ ندی کنارے اتنا خوب صورت جہاز دیکھ کر مبہوت ہو گئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ یہ کہاں سے آیا ہے؟ اگر اس کے بادبان چاندی کے نہ ہوں تو یہ بالکل ہمارے بحری عقاب جیسا ہی ہے۔ تزئین نے معاذ سے پوچھا کہ آخر اسے باندھا کس نے؟ کیوں کہ یہاں ہمارے سوا کوئی نہیں آتا۔ پھر تزئین نے اشارے سے معاذ کو دکھایا کہ یہ تو انہی کا جہاز ہے کیوں کہ اس پر بحری عقاب لکھا ہوا ہے۔ تب معاذ نے تزئین کو یاد دلایا کہ یہ صرف پریوں کا کام ہو سکتا ہے۔ ”وہ دیکھو جہاز کے عرشے پر دو چھوٹے چھوٹے کیک گرے ہوئے ہیں۔ تم نے کبھی ایسے کیک دیکھے ہیں، کیا یہ ہمارے دکھانے کے لیے ہیں؟“ اس نے تزئین سے پوچھا۔ ”لیکن بھیا! انہیں رات تک سنبھال لیتے ہیں شاید ہم بھی پریاں دیکھ لیں۔“ اس نے معاذ کو مشورہ دیا۔

انہوں نے اپنا جہاز لیا اور گھر جا کر امی کو دکھایا۔ وہ بھی جہاز کے چاندی کے بادبان کو دیکھ کر بہت حیران ہوئیں۔ اِدھر جہاز کھلونوں کی الماری میں پہنچ کر بہت خوش تھا۔ وہ الماری میں موجود باقی کھلونوں کو اپنا حیرت انگیز سفر سنا رہا تھا۔ اُدھر تزئین اور معاذ تیار تھے کہ وہ کیک پریوں کے ساتھ مل کر کھائیں گے مگر بچو! اس سے آگے مجھے معلوم نہیں کہ وہ پریوں سے مل سکے یا نہیں؟

☆☆☆

شاہ جہان اور تاج محل آگرہ

شاہ جہان مغلیہ دور کا پانچواں بادشاہ تھا۔ وہ سترہویں صدی میں ہندوستان کا بادشاہ بنا۔ اس کے دورِ حکومت کے دوران تعمیرِ نو کی ایک لہر جاری رہی جس میں دہلی اور لال قلعہ بھی شامل ہیں۔ اس کی مشہور تعمیرات میں ایک تعمیر تاج محل کی بھی ہے جو اس نے اپنی چہیتی بیوی ممتاز کی یاد میں تعمیر کروایا تھا۔ اپنے دورِ حیات کے دوران اس نے کئی ایک سفر کیے اور کئی ایک سفروں کے دوران شہنشاہ کی رفاقت سرانجام دی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی ذمہ داریوں کی سرانجام دہی میں اس کی معاونت بھی سرانجام دی۔ وہ اپنی رحم دلی اور پارسائی کے لیے مشہور تھی۔

1631 میں جب وفات پا گئی تو شاہ جہان نے اس کے مقبرے کو ایک شاہکار بنانے کی ٹھانی۔ اس مقصد کے لیے دریائے جمنا کے نزدیک ایک جگہ کا انتخاب کیا اور اپنے خوابوں کے تاج محل کو حقیقت کا روپ دے ڈالا۔ تاج محل میں باغات ہیں جن میں نہریں بہتی ہیں۔ پتھروں سے بنائی گئی دیواریں ہیں، مینار ہیں اور ایک بڑا دروازہ ہے جس کی اونچائی تقریباً 30 میٹر (10 فٹ) ہے۔ یہ مقبرہ بنیادی طور پر ایک مربع شکل کا حامل ہے جو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا ہے۔ اس کے مینار 41.75 میٹر (137 فٹ) اونچائی کے حامل ہیں۔ جب محل کی تعمیر اپنے اختتام کو پہنچی تو تب شاہ جہان کا یہ ارادہ تھا کہ جمنا کے مخالف کنارے اپنے لیے بھی سنگِ مرمر کا ایک مقبرہ تعمیر کروائے لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ اس کا بیٹا اورنگ زیب اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہو گیا اور اس کو آگرہ میں نظر بند کر دیا۔

1666 میں شاہ جہان موت سے ہمکنار ہو گیا اور تاج محل میں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہوا۔

بلاعنوان

اس تصویر کا اچھا سا عنوان تجویز کیجیے اور 500 روپے کی کتب لیجیے۔ عنوان بھیجنے کی آخری تاریخ 10/دسمبر 2014ء ہے۔

نومبر 2014ء کے ''بلاعنوان کارٹون'' کے لیے جو عنوانات موصول ہوئے، اُن میں سے مجلسِ ادارت کو جو عنوانات پسند آئے، اُن عنوانات میں سے یہ ساتھی بہ ذریعہ قرعہ اندازی 500 روپے کی انعامی کتب کے حق دار قرار پائے۔

- موٹی بنی شیطان، دبلی ہوگئی پریشان (سیدہ تحریم مختار، لاہور)
- اوہو! خدایا...... میں تو حمیدہ پہلوان بن گئی (اصول قندیل، اسلام آباد)
- نہیں......! یہ نہیں ہوسکتا! (محمد مخصم، راول پنڈی)
- ایک عورت کا مذاق، دوسری کا بُرا حال (ناعمہ تحریم، کراچی)
- تمہارا مذاق ٹھہرا کسی کی جان پر بن گئی (مریم کاشف، حیدرآباد)

ہونہار مصور
علامہ اقبالؒ
تصاویر صرف افقی رخ میں ہی بنائیں۔
آمنہ بی بی، میرپور (پہلا انعام: 195 روپے کی کتب)
علامہ محمد اقبال
عروبہ زمان، چکوال (دوسرا انعام: 175 روپے کی کتب)
فائزہ رضا، گجرات (تیسرا انعام: 125 روپے کی کتب)
ارم گل، گوجرانوالہ (چوتھا انعام: 115 روپے کی کتب)
عرشیہ مرجان، اسلام آباد (پانچواں انعام: 95 روپے کی کتب)
کچھ اچھے مصوروں کے نام بہ ذریعہ قرعہ اندازی: عاصم عمر، واہ کینٹ۔ امبر اشرف، لاہور کینٹ۔ شہرام جاوید علی، خانیوال۔ محمد ذیشان، راول پنڈی۔ جویریہ یونس، لاہور۔ طوبیٰ مرجان، اسلام آباد۔ آصف علی، مستان علی، لاہور۔ سیدہ تحریم مختار، لاہور۔ مجیب الرحمٰن، وہاڑی۔ عروبہ خان، شیخوپورہ۔ آصف علی، لاہور۔ منہا عمر، اسلام آباد۔ مشتاق احمد، جھنگ صدر۔ زویا نوید، واہ کینٹ۔ ایقہ احسان، سیال کوٹ۔ اریب زینب، راول پنڈی۔ عبدالہادی، راول پنڈی۔ احمد یار، لاہور۔ شاذل مرتضیٰ، بہاول پور۔ رومیصہ زینب چوہان، راول پنڈی۔ حذیفہ تنویر، راول پنڈی۔ نعمان ہمدانی، لاہور۔ لائبہ ناصر، جہلم۔ محمد حسن ندیم، اٹک۔ تحسین فاطمہ، اسلام آباد۔ وجاہت رسول، بہاول پور۔ سجاد حماد، سعد حماد، اوکاڑہ کینٹ۔ اسد اللہ، بہاول پور۔ سمعیہ توقیر، کراچی۔ محمد حسنات، راول پنڈی۔ زعیم احمد، لاہور۔ حنیفہ زاہد، واہ کینٹ۔ ماہ رخ ناصر، سرگودھا۔ سبیکہ آصف، لاہور۔ نمرہ ناز، راول پنڈی کینٹ۔ کشف عروج، تلہ گنگ۔ سدرہ، فیصل آباد۔ لائبہ عرفان، کراچی۔ منیر احمد، لیہ۔ عائشہ مجید، لاہور کینٹ۔ امیمہ آصف، گوجرانوالہ۔
ہدایات: تصویر 6 انچ چوڑی، 9 انچ لمبی اور رنگین ہو۔ تصویر کی پشت پر مصور اپنا نام، عمر، کلاس اور پورا پتا لکھے اور سکول کے پرنسپل یا ہیڈ مسٹریس سے تصدیق کروائے کہ تصویر اسی نے بنائی ہے۔
جنوری کا موضوع
نیا سال
آخری تاریخ 8 جنوری
دسمبر کا موضوع
مزار قائد
آخری تاریخ 8 دسمبر